U40001 12-12

Title - EK GIRJA EK KHANDAR (AFSANE).

Creator - Krishen Chand.

Publisher - National Information And Public Limited (Bombay).

Date - 1948.

Pages - 216.

Subjects - Urdu Afsane

ایک گرجا، ایک خندق

(افسانے)

کرشن چندر

شعبۂ اردو

نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ

نیشنل ہاؤس۔ ۶ ٹلک روڈ۔ اپالو بندر بمبئی ۱

طبع اوّل مارچ ۱۹۴۸ء

قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

قادری پریس انور منزل محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳ میں طبع ہوا

افسانے

ہندستان اور پاکستان کے درمیان صلح و آشتی

کی بنیادیں مضبوط کرنے والوں کے نام!

این۔ آئی پی (نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلکیشنز لمیٹڈ) کا ادارۂ اشاعت جدید سائنسی اصولوں پہ چلایا جا رہا ہے، یہ ادارہ اچھے سرمایہ سے شروع کیا گیا ہے، اس کے منتظمین کو اردو ادب سے گہری دلچسپی ہے اور اس کے کارکنوں کو رموز نشر واشاعت کا دقیع تجربہ حاصل ہے۔

این-آئی-پی-لیمٹڈ کا مقصد تعمیری ادب کے فروغ سے ہے۔ اس سیاسی بحران اور انتشار کے زمانہ میں یہ لوگ بڑی مستعدی سے اردو ادب کی شمع حیات کو فروزاں کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں یہ ہمارے ادب کے لئے یقیناً ایک نیک فال ہے۔ یہ طے کیا گیا ہے کہ اگلے بارہ ماہ میں اردو کلاسیکی ادب پر پچیس کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اور قریباً اتنی ہی کتابیں مغربی ادب سے انتخاب کرکے اردو میں چھاپی جائیں گی، اس کام کے لئے این-آئی-پی کو اردو کے بہترین ادیبوں کا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، عزیز احمد عبادت بریلوی، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، میراجی، اپیندر ناتھ وشوامتر عادل۔ مدھوسودن، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، ممتاز حسین اور دوسرے معروف ادبا اس محفل ادب کو سجانے کا کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دوسرے ممتاز ادبا بھی جلد اس طرف توجہ کریں گے۔ اور این-آئی-پی کو اپنی نوازشات کا مرکز و مرجع بناکر اردو ادب کو اسی بلند مقام پر لے جانے کی سعی کریں گے کہ جو اس برصغیر کی دوسری زبانوں کے لئے باعث صد رشک ہو جائے۔

کرشن چندر

دوسری موت

شیواجی پارک بمبئی کے مضافات میں ہے، اس کے قابلِ دید
مقامات میں ہے، گو شروع میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی
کہ یہاں کی کونسی شئے قابلِ دید ہے۔ عمارتیں ؟ عمارتیں تو بمبئی میں
چاروں طرف ہیں۔ نفیس فلیٹ ؟ تو وہ میرین ڈرائیو پر جا کر دیکھئے
جہاں ایک فلیٹ کے لئے پچیس ہزار روپے پگڑی دینی پڑتی ہے۔ ناریل
کے درخت ؟ تو وہ تو جوہو پر ہزاروں کی تعداد میں نظر آئیں گے، شیواجی
پارک میں تو خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ سمندر ؟ کبھی سمندر تو بمبئی کے
چاروں طرف ہے، اس میں شیواجی پارک ہی کی کیا خصوصیت ہے۔
کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے اس قدر قابلِ دید مقام کیوں سمجھا گیا ہے۔

دراصل یہ بات اتنی جلدی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے مشیواجی پارک میں رہنا ضروری ہے۔ اور کوئی دو چار مہینے رہنے سہنے سے کام نہ چلے گا، برسوں کی مستقل رہائش چاہیے۔ جب جا کے اس کی قابلِ دید و شنید خصوصیات کا پتہ چل سکے گا!

مثال کے طور پر مجھے اپنی اقامت کے پہلے چھ ماہ میں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ میرے فلیٹ کے بالکل اوپر دوسرے فلیٹ میں شراب کی بھٹی ہے۔ مسٹر ردمولو جو اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے ایک ماہر بٹن ساز تھے اور ایک سندھی کارخانے دار کی بٹن فیکٹری میں ملازم تھے۔ جب وہ پکڑے گئے تو اچانک ہی ہمیں پتہ چلا کہ وہ صرف ایک ماہر بٹن ساز ہی نہیں تھے، ماہر شراب بھی تھے۔ ان کی بھٹی کی کشیدشدہ شراب ذائقے، رنگت اور تاثر میں مشہور فرانسیسی شرابوں کو بھی مات کرتی تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ پہلے چھ ماہ تک تو ہم انہیں بٹن سازی کا ماہر سمجھتے رہے۔ مسٹر ردمولو بڑے ملنسار، ہنس مکھ انسان تھے۔ اکثر اترتے چڑھتے بلڈنگ کی سیڑھیوں پر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اور کئی کئی منٹ تک حیدرآباد کے بٹن اور بیجاوڑ کے بٹن اور کانپور کے چمڑے کے بٹنوں پر ان سے دلچسپ گفتگو رہتی تھی۔ اور پھر نام کتنا اچھا تھا۔ ردمولو۔۔۔ زبان پر کس نفاست سے گھومتا ہے۔ ردمولو۔۔۔۔ ردمولو۔۔۔ کتنی گھلاوٹ ہے اس نام میں۔ لکھنؤ کی بالائی کا سا

مزا ہے۔ اور ایک اسی شیواجی پارک میں میرے دوست رہتے ہیں۔
نام ہے خواجہ مہند نبا ض۔ نام سُن کے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی
گھوڑا کچے شلغم چبا رہا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے۔ ایسے نام کا آدمی
کبھی دنیا میں ترقی کر سکتا ہے؟ خیر، تو ذکر مسٹر رومولو کا ہو رہا تھا۔
جب وہ ناجائز شراب کے جُرم میں دھر لئے گئے تو مجھے بڑی حیرت
ہوئی۔ میرے ایک اور دوست ہیں جو اسی بلڈنگ میں رہتے تھے۔
دس سال فرانس میں رہ کے آئے تھے۔ بڑے خوش ذوق آدمی تھے۔
موٹر گاڑی بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب میرے رشتے دار گاؤں
سے بمبئی کی سیر کے لئے آتے تو میں اُن سے گاڑی مانگ لیتا تھا۔
وہ امپورٹ اکسپورٹ کے تاجر تھے۔ اور فیروز شاہ مہتہ روڈ پر اُن
کا دفتر تھا۔ مسٹر رومولو کی گرفتاری پر ہنس کے فرمانے لگے "بھئی
کچھ بھی ہو، رومولو برانڈ کی شراب کا جواب بمبئی میں نہیں ہے۔ اسے
چکھ کر پیرس کی گلیاں یاد آجاتی ہیں۔ اور فرانسیسی کنواری کا جسم
جو اب خود پیرس میں نایاب ہوتا جا رہا ہے، آنکھوں کے آگے
گھومنے لگتا ہے۔"
"مگر" میں نے اپنے دوست سے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ
یہ چلن!........"
انہوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تم تو نرے چغد ہو۔ ارے
میاں یہ شیواجی پارک ہے۔ یہاں ہر آدمی دو کام ضرور کرتا ہے۔

ایک سفید مارکٹ کا، ایک بلیک مارکٹ کا۔ سفید مارکٹ میں پیسہ نہیں ہے۔ پیسہ تو صرف بلیک مارکٹ سے ملتا ہے۔ مسٹر روسولو کی شراب ملبار ہل پر جاتی تھی، بڑے بڑے امیر گھرانوں میں۔ خود بمبئی کے پولیس کمشنر نے اکثر دعوتوں میں اس شراب کو چکھا ہے۔ کیا بات کرتے ہو"
جب پولیس مسٹر روسولو کو لے گئی تو مجھے بڑا افسوس ہوا میرے دوست کہنے لگے۔ "اماں کیوں افسوس کرتے ہو؟ وہ بڑا پرفن اور کائیاں ہے۔ دُور تک اُس کی پہنچ ہے۔ دیکھنا بہت جلد چھوٹ جائیگا"
اور یہی ہوا۔ چند دنوں میں میں نے مسٹر روسولو کو ہنستے کھیلتے واپس آتے دیکھا۔ مگر اب وہ شیواجی پارک کا فلیٹ تبدیل کر رہے تھے۔ دس ہزار روپیہ پگڑی پر اُنہوں نے اپنا فلیٹ ایک سندھی شرنارتھی کو دے دیا جو بچارہ کراچی سے اپنی جان بچا کے بمبئی بھاگ آیا تھا۔ اُسے اپنے دالمیشین کتے کا بڑا افسوس تھا جو کراچی ہی میں رہ گیا تھا۔ بیوی بچے، زیور دولت سب کچھ وہ لے آیا تھا مگر اُس کے مکانات، اُس کا کارخانہ اور اس کا باغ وہیں رہ گیا تھا۔ مگر ان چیزوں کا اُسے اتنا افسوس نہ تھا جتنا اس کے دالمیشین کتے کا جو غلطی سے کراچی میں رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنے مسلمان دوستوں کو کئی تار دئے مگر وہ لوگ اتنے کٹّر پاکستانی تھے کہ اُنہوں نے بچارے کا کتا وہیں رکھ لیا۔ بڑا خوبصورت کتا تھا وہ۔ سپید براق جلد پر چتلے چتلے داغ، جیسے نئے فیشن کی ساڑیاں نہیں ہوتی ہیں، بس اُس کا پیارا دالمیشین بھی

اُسی ڈیزائن کا تھا۔ ظالم پاکستانیوں نے ہتھیا لیا۔ اور ہماری سرکار ہے کہ ایسے شرنارتھیوں کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی!

یہ بات کہ شیواجی پارک میں ہر آدمی دو کام کرتا ہے مجھے جچی نہیں اور جچی تو اُس وقت جب میرے دوست خود لڑکیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ اُن کا امپورٹ اور اکسپورٹ کا دفتر بھی جو فیروزشاہ مہتہ روڈ پر تھا دراصل لڑکیوں کی امپورٹ اور اکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ اور یہ کام غریب پنجابی شرنارتھیوں کی آمد سے اور بھی بڑھ گیا تھا۔ انہی دنوں میں میرے دوست نے ایک نئی ڈیلج خرید کی تھی اور اُس میں اکثر خوبصورت لڑکیوں کو ڈرائیو کے لئے لیجایا کرتے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں تو اتنی فیشن ایبل تھیں کہ مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کی بھی امپورٹ اکسپورٹ ہوتی ہے۔ اس قدر ہائی کوالٹی کا مال ہوتا تھا کہ پولیس کی نگاہ بھی چوک جاتی تھی۔ اور پھر بڑے بڑے دوست تھے میرے دوست کے۔ اُن کے فلیٹ میں میری ملاقات نواب آف گھسیارو سے ہوئی، منسٹر جی حضوری سے ہوئی، مولانا شرف اللہ سے ہوئی، سیٹھ دمپت چورا ڈریا سے ہوئی۔ کیا لوگ تھے وہ۔ ہر ایک کے پاس پندرہ بیس بلڈنگیں، آٹھ دس گاڑیاں، پانچ سات داشتائیں اور دو چار سیاسی لیڈر نوکر تھے۔ اور جب میں اپنے دوست سے کہتا "بھئی تم بڑے بارسوخ ہو، ایک بزنس ہمیں بھی کرا دو" تو اپنے

موٹے سگار کی راکھ جھاڑ کر کہتے "ارے بھئی تم کیا جانو اس بزنس میں کتنی پریشانی ہے۔" اب پتہ چلا جب پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی کہ اس میں کتنی پریشانی ہے۔ سُنا ہے لڑکی جو اکسپورٹ کی گئی صرف تیرہ سال کی تھی۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے پندرہ سو میں بیچ دیا تھا۔ میرے دوست نے اُسے ایک ریاست میں سات ہزار روپے پر اکسپورٹ کر دیا۔ کسی نے بیچ میں کمیشن زیادہ مانگا اور میرے دوست نے نہیں دیا۔ اُس نے پولیس میں اطلاع کر دی اور آپ جانیے پولیس تو ایسے معاملوں کی تاک میں رہتی ہے۔ بچارے شریف آدمی کو گرفتار کر لیا۔

ایسے واقعات شیواجی پارک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا، بھنڈاری۔ بچارہ کراچی سے بزنس کے لئے آیا تھا۔ یہاں ایک گجراتی لڑکی سے عشق کر بیٹھا، اور بزنس کی بجائے اس نے ایک روز لڑکی کی بے مہری سے تنگ آ کر زہر کھا لیا۔ آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو کہیں اس لڑکی کے لئے زہر تو کیا مٹھائی بھی نہیں کھائی جا سکتی، مگر دل ہی تو ہے۔

شیواجی پارک میں کارخانے دار رہتے ہیں اور کرخندار بھی۔ سیٹھ لوگ بھی اور سیٹھوں کے غلام بھی۔ کہیں کہیں فلم ایکٹر بھی نظر آ جاتے ہیں۔" وہ گھر دیکھا تم نے، یہاں پر شری گھوسن رہتے ہیں۔"

"شری گھوسن! سچ مچ؟"

"ہاں!"

"وہی شری گھوسن جنہوں نے چڑی کا یکہ، اور چور کا مور اور گوبھی کے پھول میں کام کیا ہے؟"

"ہاں!"

"کمال ہے بھئی، یہ چھوٹا سا مکان اُن کا ہے"

"اور وہ جو مکان ہے نا، جس کے باہر بھنگن جھاڑو دے رہی ہے، وہاں دمساز لانتی رہتی ہے۔"

"دمساز لعنتی!"

"لعنتی نہیں لانتی۔ عین غائب ہے"

"دمساز لعنتی! جھوٹ تو نہیں بولتے! وہی دمساز لعنتی جو بد قسمت، من کی پھوار اور میں کیسے بکوں کی ہیروئن ہے؟"

"وہی! وہی!"

"بھئی یقین نہیں آتا! اتنی بڑی ہیروئن یہاں رہتی ہو"

"یقین نہ آتا ہو تو اس بھنگن سے پوچھ لو"

"کمال کر دیا بھئی!"

"کیا سمجھتے ہو۔ یہ شیواجی پارک ہے" میرا گائیڈ جواب دیتا ہے۔

اب مجھے یہاں رہتے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ شیواجی پارک واقعی قابلِ دید جگہ ہے۔ یہاں فلم انڈسٹری کے بہترین ہیرو اور ہیروئن موجود ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ

اور کارخانے دار، اخباروں کے مالک اور بڑے بڑے جرنلسٹ جن کے قلم کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ اور پھر معمولی لوگ بھی رہتے ہیں۔ دھوبی، نائی، کلرک، ادیب، مٹھائی بیچنے والے، کنجڑے، ڈرائیور، ویٹر، پان والے، پھول والے، ناریل والے، دہی بڑے کی چاٹ والے، معمولی لوگ جن میں طوائفیں بھی شامل ہیں۔ شیواجی پارک دوسری انسانی آبادیوں کی طرح ہی ایک اور آبادی ہے۔ اس آبادی میں ہندو زیادہ ہیں مسلمان کم، یوں سمجھیے کہ سو میں سے پچانوے تو ہندو ہوں گے اور اور پانچ مسلمان۔ ہندوؤں میں ستّر مرہٹے ہوں گے اور بیس گجراتی باقی پانچ فلم ایکٹر سمجھیے۔ مرہٹے بالعموم متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی اولاد ہیں گجراتی امراء کے طبقے میں قدم رکھتے ہیں۔ اور جو فلم ایکٹر ہیں وہ ان دونوں طبقوں میں گزرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگ لاکھوں کماتے تھے۔ جنگ کے بعد لاکھوں گنوا دیئے انہوں نے۔ آجکل بیکاری کے زمانے میں ہندو سیوک سنگھ میں نام لکھا لیا ہے۔ اور ہندو دھرم سے عشق کرتے ہوتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں رنڈیوں سے عشق کرتے تھے۔ کبھی کبھی غور کرتا ہوں تو اپنی ساری زندگی، نجی شخصی قومی زندگی، اسپورٹ اکسپورٹ کے اصول پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے!

شیواجی پارک میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ مگر،

۱۷

عرصہ چھ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اپنے فلیٹوں میں آرام سے رہتے ہوں یا دکھ سے رہتے ہوں، شرافت سے ضرور رہتے ہیں۔ کیونکہ انسانی برادری کے ہزاروں افراد غنڈہ گردی کے اصول پر کسی آبادی کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتے۔ اس لئے بچے آسانی سے گلیوں میں گھومتے ہیں۔ عورتیں آزادی سے پارک میں سیر کرتی ہیں، دوکانوں پر سودا سلف خریدتی ہیں۔ مرد دفتروں، کارخانوں، دوکانوں پر کام کرتے ہیں۔ اور شام کو ایک قمیص دھوتی پہنے ہوئے سمندر کے کنارے آجاتے ہیں، اور گلچھپ اڑاتے ہیں۔ ننھے ننھے کھلونوں کی ننھی ننھی حرکات اور قریب ہی سمندر کی گھن گرج گونج چاروں پہر سنائی دیتی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی انسانی مسرتوں کے لئے پس منظر موسیقی کا کام دیتی ہے۔ کبھی موسیقی ہے تو کبھی گرج ہے۔ کبھی خطرہ ہے تو کبھی خوشی ہے۔ سمندر کی گونج ہر آن انسانی خوشیوں اور دکھوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اور شیواجی پارک کی انسانی آبادی اس گونج میں اپنے ڈھنگ کے سُر ڈھونڈتی رہتی ہے!

۳

میری اقامت کے چھٹے سال شیواجی پارک میں اک طوفان اُٹھا۔ یہ طوفان بہت دُور سے آیا تھا۔ گو سمندر شیواجی پارک کے

بہت قریب ہے لیکن یہ طوفان اُس سمندر سے نہیں آیا تھا۔ یہ طوفان بہت دُور سے، آج سے ایک سو سال دور پیچھے سے آیا تھا۔ یہ طوفان غدر سے شروع ہوا اور پندرہ اگست کو سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ انسانی تاریخ کے اس طوفان نے ہر ہندوستانی گھر کی چولیں ہلا دیں، اور کہیں نہ کہیں اُس کی روح میں، اُس کے جسم میں، اُس کے ذہن میں، اس کے آداب، اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور پیدا کر دیا۔ یہ بڑا بھاری طوفان تھا جو صدیوں کے بعد ہی انسانی زندگی میں آتا ہے۔ گو اسے شروع ہوئے ایک سو سال سے زائد عرصہ نہ ہوا تھا۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ طوفان نہ تھا دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ ایک طوفان جو ایک سو سال پہلے شروع ہوا؛ دوسرا طوفان جو اس سے کہیں پہلے منوسمرتی کی جارحانہ براہمنیت سے شروع ہوا سینکڑوں سال پہلے۔ وہ براہمنیت جو بُدھ کے عروج کا باعث بنی، جس نے اسلام کو فروغ دیا، جس نے اچھوت پیدا کئے، آج پاکستان کو جنم دے رہی تھی۔ بلاشُبہ یہ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ قومیت کا سیلاب اور براہمنیت کا ردّ عمل۔ قومیت کا سیلاب آزادی لایا، براہمنیت کے ردّ عمل نے پاکستان کی تشکیل کی۔ اور اب دونوں طوفان ٹکرا رہے تھے۔ بجلی کی کڑک، رعد، گونج، گرج، انسانی چیخیں، خون کی لہریں، بجلی جو گھروں کو جلا گئی، عصمتوں کو جلا گئی، کھیتوں کو جلا گئی، انسانوں کو جلا گئی۔

اور یہ طوفان اُدھر سے آیا جدھر سے آریہ لوگ آج سے ہزاروں سال
ہند میں داخل ہوئے تھے۔

سردار دُوھتّر سنگھ اس ریلے میں بہتا بہتا شیواجی پارک
آ نکلا تھا۔ دُوھتّر سنگھ لائلپور کا ہٹا کٹا کسان تھا۔ جسم و جان کا
مضبوط۔ اُس کے آبا و اجداد نے لائلپور کی بنجر زمین میں اپنی محنت
سے بہار کے پھول اُگائے تھے۔ وہ لائلپور کا بُوٹا تھا۔ جس طرح
وہاں کی گندم، وہاں کی روئی اور وہاں کے پیلو لائلپور کے تھے۔ جب
ایک بوٹے کو اُس کے جغرافیائی ماحول، اس کی مخصوص آب و ہوا،
اس کی زمین سے اُکھاڑ لیا جائے تو دوسری جگہ اس کی کاشت مشکل
سے ہو سکتی ہے۔ اس معمولی امر کو جیسے ہر کسان اچھی طرح سمجھتا ہے
ہمارے ملک کے تقسیم کرنے والے تقسیم کے وقت بھول گئے تھے۔
دُوھتّر سنگھ کے قدم شیواجی پارک میں نہ جمتے تھے۔ اسکی جڑیں
اس کی غذا کو قبول نہ کرتی تھیں۔ اس کی رگیں مرجھانے لگی تھیں۔
وہ تندرست پودا نہ تھا، بیمار پودا تھا۔

دُوھتّر سنگھ کی زمین اس کے پاس نہ تھی۔ اُس کی بیوی
لائلپور کے ایک جانگلی سردار نے اغوا کرلی تھی، اس کی آنکھوں
کے سامنے۔ اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ اُس کے ماں باپ اس کے
سامنے موت کے گھاٹ اُتار دئیے گئے۔ پھر فوج کی مدد پہنچ گئی
اور وہ بچ گیا۔ لیکن کرپان اس کے پہلو میں ہر وقت لٹکتی رہتی تھی۔

محنت کش کسان، ماہیا اور ہیر گانے والا کسان، ہنسی اور ٹھٹھول میں غرق رہنے والا کسان خون کا پیاسا بن گیا تھا۔ اس نے آتے ہی جب دیکھا کہ شیواجی پارک میں مسلمان بڑے مزے میں رہتے ہیں تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ گلی میں سے گذر رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک پٹھان پر پڑی جو مس دَمساز لاثانی فلم اسٹار کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اُسے بلوچی سپاہی یاد آئے جنہوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ اس نے معاً ست سری اکال کا نعرہ بلند کیا اور کرپان نکال کر پٹھان کو وہیں تہہ تیغ کر دیا۔

شیواجی پارک میں ہندو مسلم فساد کی یہ پہلی واردات تھی۔ پولیس تحقیقات کے لئے آئی لیکن مجرم کا پتہ نہ چلا۔ اسی رات غنڈوں نے ایک کمیٹی بلائی اور دُوھتّر سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ شیواجی پارک سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے سردار دوھتّر سنگھ کو سردار مقرر کیا گیا۔

دوسری رات کو سردار دوھتّر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ اُن میں کئی ایک خود غنڈے تھے اور اس فساد کے شروع ہونے سے پہلے ہندو غنڈوں کے ساتھ مل کر شہریوں کو بلیک میل کیا کرتے تھے۔

امجد نے مرتے مرتے کہا " ارے دھار کر، زندگی بھر تیرا میرا ساتھ رہا ہے۔ یاد ہے جب ہم نے مل کر سیٹھ دھپت کی لے عزتی کی تھی؟—

جب نعروان جی پارسی کو سمندر میں ڈبویا تھا؟ جب ایرانی ہوٹل والے کو لوٹا تھا؟ اور آج تو ہم پر ہی تلوار لے کر چڑھ آیا ہے دوست!"
دھارکرنے پریشان ہو کر کہا" کیا کروں دوست مجبوری ہے۔ ہندو دھرم کا معاملہ آن پڑا ہے ورنہ کوئی بات نہ تھی۔"
'ست سری اکال' کہکر دوہتّر سنگھ نے امجد کا سر اڑا دیا۔
اگلے روز بہت سے مسلمان شیواجی پارک اور اُسکے نواحی علاقوں کو خالی کرنے لگے۔ وہی فلیٹ جو دس ہزار پگڑی پر بھی نہ مل سکتے تھے اب دو دو ہزار روپے پر جانے لگے۔ بلکہ کئی لوگ تو یونہی خالی کرتے گئے۔ موٹریں جو پندرہ سولہ ہزار کی مالیت کی ہونگی پندرہ سو میں بکنے لگیں۔ بجلی کے پنکھے' ریڈیوگرام' ہر گراں شے کے دام کوڑی ہو گئے۔ اور یہ سب سردار دوہتّر سنگھ کی بر وقت رہنمائی کے طفیل تھا۔ اب گجراتی سیٹھ اُسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے تھے' گجراتی سیٹھانیوں نے اُس کے گلے میں ہار پہنائے۔ امجد کی خوبصورت مرہٹی بیوی اُس نے اپنے ہاں رکھ لی اور اسے امرت چکھا دیا۔ ہر روز شراب کی بوتل اس کے پاس پہنچ جاتی اور سو پچاس روپے بھی۔ اب وہ سیٹھوں کی محفل میں رہتا تھا' ان کی موٹروں میں گھومتا تھا اور گلی بازار میں اکڑ کر یوں چلتا تھا جیسے شیواجی پارک کا مالک وہی ہے۔ اب اس کے جسم سے لائلپور کی سوندھی مٹی کی بُو نہیں آتی تھی۔ اب اُس کے جسم کے ذرّے ذرّے سے لالچ اور خون کی بُو آتی تھی۔ اب اس کی زبان پر

ماھیا اور ہیر کے گانے نہیں تھے، اب وہ فلموں کے بازاری گیت گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہل نہیں تھا، خنجر تھا۔ وہ ڈُو ہتّر سنگھ مر گیا تھا جو لائلپور کا کسان تھا۔ وہ دو ہتّر سنگھ زندہ تھا جسے دو طوفانوں کی ٹکر نے جنم دیا تھا۔ اب وہ ہندو دھرم کی عزت کا محافظ تھا اور جن لوگوں نے اس کے ذریعے فلیٹ حاصل کیے تھے، اور موٹریں، اور پھر انھیں بازاروں ہزاروں کے منافع پر بیچا تھا، اس کے قدموں میں بچھے جاتے تھے اور اس کی آؤ بھگت دیوتاؤں کی طرح کرتے تھے۔

اب یہ طوفان بھی گذر چلا ہے۔ مسلمان شیواجی پارک سے نکال دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دُکا گھر مسلمانوں کا رہ گیا ہو تو رہ گیا ہو، مجھے اس کی خبر نہیں۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زندگی اب پھر پرانے ڈھرے پر آچلی ہے۔ لوگ باگ پھر راتوں کو گھروں سے سیر کے لئے نکلنے لگے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے قہقہے بھی سُنائی دیتے رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے کنارے دہی بڑے والے، پھول والے اور ناریل بیچنے والے گھوم رہے ہیں۔ ٹھیلوں پر شمعیں روشن ہیں اور گجراتی سیٹھوں کی قیمتی گاڑیاں زناٹے سے گذر جاتی ہیں اور آدمی اُنہیں تکتا رہ جاتا ہے۔ ڈُو ہتّر سنگھ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے گھر اب شراب کی بوتل پہنچائی نہیں جاتی، نہ سو پچاس روپلے کی آمدنی ہے۔ کوئی اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار نہیں پہناتا،

اُسے ہندو دھرم کا رکھشک نہیں بتاتا۔ بڑے بڑے سیٹھ جو فساد کے دنوں میں اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتے تھے اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

دُوہتّر سنگھ طوفان کا اُکھڑا ہوا پودا ہے۔ ڈول رہا ہے۔ زہر اس کی رگ رگ میں سرائت کر چکا ہے۔ اس کے حامی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں مگر ایک معقول تعداد ابھی باقی ہے۔ کم تنخواہوں والے کلرک، دھوبی، نائی، کنجڑے، ڈرائیور، کرخندار بیکار، زندگی کے ستائے ہوئے لوگ اور غنڈے جنہوں نے کبھی ماں کا دودھ پیا تھا اور آج زندگی کا زہر پیتے ہیں یہ لوگ سوچتے ہیں کہ مسلمان چلے گئے لیکن بیکاری ختم نہیں ہوئی، کپڑا نہیں ملتا، مکان نہیں ملتا، تنخواہ نہیں بڑھتی۔ مسلمان چلے گئے لیکن چیزیں سستی نہیں ہوتیں۔ ہاں امیروں کے پاس موٹریں اُسی طرح ہیں، ان کے گھروں میں وہی شان و شوکت ہے، ان کے کارخانے اسی طرح چلتے ہیں۔

مسلمان چلے گئے، بھگا دیے گئے، مار ڈالے گئے۔

لیکن دوہتّر سنگھ بدستور بھوکا ہے۔

دو چار روز تو اُس نے صبر کیا۔ پھر پریشان ہو کر اُس نے سیٹھ دمپت کی موٹر روک لی اور اس سے کہا "سیٹھ وہ تمہارے وعدے کدھر گئے؟"

سیٹھ نے خشونت سے کہا "کیسے دھاسے؟"
"وہی، میں یہ کروں گا وہ کروں گا"
"کیا نہیں کیا میں نے، اور کیا مانگتا ہے؟ یہ لے پانچ روپے"
"پانچ روپے نہیں چاہئیں۔ وہ تیسرے آدمی کو جو کرنل مشرف کا فلیٹ دلوایا تھا اس کا کمیشن پانسو بنتا ہے۔ وہ بولتا تھا، دوں گا۔ ابھی تک نہیں دیا"
"تو مجھ سے کیوں مانگتا ہے؟ راستے میں موٹر روک کے کھڑا ہے۔ سالا۔ پولیس میں چالان کرا دوں گا"
"پولیس میں چالان کرا دے گا؟" دو بہتر سنگھ گرجا "تیری بہن دی ——"
زور سے موٹر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اور وہ سڑک پر گر کر مرتے مرتے بچا۔
رات کو اس نے سیٹھ دمپت کے آدمی کو قتل کر دیا جس نے اسے پگڑی کا کمیشن نہیں دیا تھا۔ اب انہی سیٹھوں نے اسے گرفتار کرا دیا جنہوں نے بیسیوں مسلمانوں کے قتل ہو جانے پر بھی اسے پولیس کے ہاتھوں سے بچا لیا تھا۔ جھوٹی گواہیاں دے کر۔ اب وہ ہندو دھرم کا رکھشک نہ رہا تھا، شیواجی پارک کے امن کا دشمن تھا۔
اس کے خلاف جو الزام لگائے گئے، وہ یہ تھے :-

۱۔ وہ پنجابی تھا۔

۲۔ وہ پنجابی غنڈہ تھا۔

۳۔ وہ سکھ تھا۔

۴۔ وہ سکھ قاتل تھا۔

۵۔ اُس نے ایک مسلمان عورت کے خاوند کو قتل کر کے اُسے اپنے ہاں زبردستی رکھ لیا تھا۔

۶۔ اُس نے سیٹھ دمیت مارواڑی کی موٹر روک لی تھی۔

۷۔ موٹر روک کر اُس نے قتل کی دھمکی دی تھی۔

۸۔ اُس نے سیٹھ دمیت کے پارٹنر کو قتل کر دیا تھا اور اُس فلیٹ میں دوسرے لوگوں کو قتل کرنے جا رہا تھا کہ اُسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔

۹۔ وہ شیواجی پارک میں جہاں صرف شریف لوگ بستے ہیں امن کے لئے خطرہ تھا۔

ان الزامات کی بنا پر اُسے نو دفعہ پھانسی کی سزا ہو سکتی تھی لیکن اُسے صرف ایک دفعہ پھانسی کی سزا ہوئی۔ اور وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور اس طرح دوہتڑ سنگھ۔ سردار۔ قوم سکھ۔ عمر تیس سال۔ ساکن لائلپور۔ مر گیا۔ تاریخ وفات ۲۰ اکتوبر سنہ ۴۷ء

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ مار ڈالا گیا تھا۔ سردار دوہتڑ سنگھ جو لائلپور کا کسان تھا جس کی عمر تیس

سال کی تھی اور جو ماہیا اور ہیر گایا کرتا تھا، اور ہر روز اپنے کھیتوں پر کام کرتا تھا؛ جس کے بوڑھے ماں باپ تھے، ایک نوجوان شرمیلی بیوی تھی، اور شریر آنکھوں والے معصوم بچے، وہ سردار پندرہ اگست کو مار ڈالا گیا تھا۔ یہ قتل باہمی سمجھوتے سے ہوا اور اسکے قاتلوں میں کانگریسی بھی تھے اور لیگی بھی، اور ہر وہ ہندوستانی جس نے اپنے آرام کی خاطر پنجاب کی روح کے دو ٹکڑے کر دئے تھے۔

علیا آباد کی سرائے

پیر پنجال کے قریب پہنچ کر تو میں تھکن سے بالکل نڈھال ہو گیا۔ ایک تو شدید چڑھائی تھی، اور راستہ بیحد ناہموار، سہ پہر کو دھوپ ماند پڑ گئی تھی، گویا وہ بھی تھکی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ اور راستے پر اخروٹوں کے سائے گھنے اور دراز ہو گئے تھے۔ فضا میں اک خنکی سی رچ گئی تھی اور پاؤں رکابوں میں پڑے پڑے سُن ہو گئے تھے اور اب اُن میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، اور یہ سوئیاں رینگتی ہوئی پنڈلیوں سے رانوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں خچر سے اُتر پڑا، اور میرے پیچھے آنے والے خچر پر سے میرا ملازم بھی اُتر پڑا، اور پھر ہم دونوں خاموشی سے اوپر چڑھتے چڑھتے پیر پنجال کی چوٹی پر پہنچ گئے۔

جہاں پیر صاحب کی قبر تھی، اور ایک بے برگ درخت کی شاخوں سے منت مانگنے والوں نے سینکڑوں پوٹلیاں لٹکا رکھی تھیں۔

مرقبان نے دونوں خچر ستانے کے لئے چھوڑ دئیے۔ اس نے قبر کو تعظیم دی اور پھر وہ قبر کے سامنے دکان پر سے چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ دوسرے مرقبان نے تیسرے خچر پر سے میرا اسباب اُتار دیا۔ اسباب اُتارتے ہی وہ خچر زمین پر لوٹنے لگا، شاید اس کے بدن میں بھی میری طرح سوئیاں چبھ رہی ہوں گی۔ ملازم نے مجھے بوتل سے چائے نکال کے پیش کی اور توس پر رس بھری مربّہ اور مکھن لگا کے کھلایا۔ پھر دیر تک وہ میرے پاؤں دباتا رہا، حتیٰ کہ مجھے نیند سی آگئی اور میں قبر کی طرف پیٹھ کر کے ایک بڑی سی سِل پر سونے لگا۔

مرقبان نے آکے کہا "صاحب، یہ پیر صاحب کی قبر ہے ادھر پیٹھ کر کے نہ سوئیے۔" ملازم نے کہا "اور میری مانیے تو بالکل نہ سوئیے۔ شام ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں علیا آباد کی سرائے تک پہنچنا ہے۔ اور راستے میں گھنا جنگل ہے۔"

میں نے ایک نظر نیچے کو دوڑائی۔ ہم لوگ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور چاروں طرف بلند و بالا سلسلہ ہائے کوہ تھے۔ بے ریش برودت چوٹیاں غروب آفتاب کے وقت اس نیلگوں منظر میں سنہری کٹوریوں کی طرح جھلک رہی تھیں، اور نیچے چھ سات ہزار فٹ تک خطرناک

اُترائی تھی۔ اور پھر علیا آباد کی رکھ شروع ہوتی تھی جہاں شکار کیلئے چیتے، ریچھ، سٹور، سنہولے، ہرن، باآسانی دستیاب ہوتے تھے۔ اور اس جنگل کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی گھاٹی پر علیا آباد کی سرائے تھی۔ اکیلا جنگل اس سبز مخملیں مرغزار میں ترشے ہوئے نیلم کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے کہا "علیا آباد کی سرائے بہت دُور تو نہیں، وہ پیچھے رہی۔ اور جنگل کے جانوروں سے ہمیں کیا ڈر۔ رائفلیں ساتھ ہیں"

"خچر ڈر جائیں گے" دوسرے مرقباں نے کہا "شام ہونے کے بعد اس جنگل سے کون گذر سکتا ہے صاحب، موت کا سامنا کرنا ہے"

ملازم نے پھر کہا "آپ سوئیے نہیں سرکار۔ پندرہ بیس منٹ آرام فرمالیجیے، پھر چل دیں گے"

"اچھا" میں نے بے چین بے بس ہو کر کہا، اور اپنا غصہ چھپانے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا اور واپس اُسی ڈھلوان کی طرف چل دیا جدھر سے ہم لوگ ابھی آئے تھے۔ "میں ابھی آتا ہوں، چشمے تک ہو آؤں"

گھاٹی کی اوٹ میں کوئی تین چار سو فٹ ڈھلوان کے بعد ایک تنگ کے درخت کے نیچے یہ خوبصورت چشمہ تھا۔ ایسا ٹھنڈا اور میٹھا پانی۔ اور کنارے گرج کے جھاڑ تھے، میں ان میں سے گرچ توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ یکایک قریب کے جھاڑیں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی اور میں چوکنا ہو گیا۔ اودے اودے گہرے نارنجی گرچوں کے خوشے

جنگلی ریچھوں کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ ریچھ یا شہد مزے سے کھاتے ہیں اور یا پھر گرج۔ میں نے غور سے جھاڑی کی طرف سے دیکھا۔ دوسری طرف کوئی کالی سی شے سرک رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ بغیر آہٹ کئے پیچھے ہٹنے لگا۔ اتنے میں وہ شے کھڑی ہونے لگی۔ میں نے سمجھا اب موت آ گئی۔

مگر ریچھ نہیں تھا، سیاہ سُوسی پہنے ہوئے ایک گجر لڑکی تھی۔ اتنی صبیح، ٹھوڑی جیسے برف، گال جیسے سیب، آنکھیں جیسے نرگس۔ یہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہر چیز اس قدر خوبصورت کیوں ہو جاتی ہے۔ اب ان عورتوں ہی کو دیکھیئے، عورت گھریلو پالتو جانور ہے۔ دن رات کی چخ چخ۔ اور اسے میدانوں میں دیکھکر ہر وقت تیل، پسینے، دھوئیں اور مطبخ کی یاد آتی رہتی ہے۔ شاید بارہ ہزار فٹ پر زمین آسمان کے اسقدر قریب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تو پانی اِسقدر شفاف اور میٹھا ہے۔ ہوا اسقدر مصفّا اور معطّر ہے۔ اور عورت اور وہ بھی گجر عورت جو میدانوں میں اسقدر کالی کلوٹی اور بھینس کیطرح موٹی اور بدصورت ہوتی ہے یہاں اسقدر پتلی چھریری ہے۔ اور رنگت اسقدر نازک نازک سی سنہری، گویا صبح کے شبنمی دھندلکے میں سُورج کی کرنیں جھلملا رہی ہیں۔

میں نے کہا "تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں سمجھا کوئی ریچھ ہے"

وہ ہنسنے لگی۔ بولی "اجنبی ہو اسی لئے ایسی بات کہتے ہو۔ جانتے ہو

یہاں پیر کی قبر ہے۔ یہاں کوئی جانور نہیں آ سکتا۔"
"کیوں؟"
"حکم نہیں ہے"
"تو کیا حوروں کو آنے کا حکم ہے"
وہ خوش ہوگئی۔ بولی "دودھ پیو گے؟"
میں کچھ غلط سمجھا۔ آگے بڑھا۔ وہ جھاڑی میں غائب ہوگئی۔ میں اور آگے بڑھا۔ وہ جھاڑی میں غائب ہو چکی تھی۔ میں بالکل اُسکے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے جھاڑی کے تلے مٹکا دبا رکھا تھا۔ دودھ بھرا مٹکا۔ جو دن کی گرمی میں اُسی جھاڑی کے نیچے مٹی میں دبا رہتا ہے اور شام کے وقت نکالا جاتا ہے۔ یہ مٹی، بارہ ہزار فٹ کی بلند مٹی، برف گھر کا کام کرتی ہے۔ اُس نے مٹکے کا ڈھکنا اُٹھایا۔ اتنا گاڑھا دودھ تھا، برف کی طرح سپید۔ دودھ سے جنگلی پھولوں کی بُو آ رہی تھی اور مٹکے کے کنارے کنارے مکھن کے نرم و نازک کرسٹل پیدا ہو گئے تھے اُس نے مٹکے کا منہ میری طرف بڑھا دیا۔ بولی "پیو"
میں اُس کے ہونٹوں طرف دیکھنے لگا۔ نہایت ہی باریک پتلے پتلے لب، اور اتنے خطرناک سُرخ۔
اُس نے پھر کہا "پیو"
میں اُس کی لہرائی ہوئی زلفوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو گرتے گرتے رُخ سے مچل کر ٹھوڑی کے ایک کونے پر آ گئیں تھیں۔ اور

ٹھوڑی کی جلد ناشپاتی کی طرح بے داغ تھی۔ نیچے گردن اور سینے کے اتصال پر ایک خوبصورت گڑھا تھا جس کے اندر اک رگ تڑپ رہی تھی۔ میرا سانس تیز ہو گیا، اور اُس کے چہرے کا رنگ سپید سے سُرخ اور سُرخ سے گہرا سُرخ ہو گیا اور اُس نے سرگوشی میں کہا "پیو"؛ اور میں نے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں میں پیوست کر دئے۔ اور اُس نے مٹکا آہستہ آہستہ سے زمین پر چھوڑ دیا۔ اور میں نے اُس کے ہونٹوں کی آگ کو پی لیا، اور وہ ساری کی ساری اُس آنچ میں پگھل گئی۔

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھکر کہا "یہ تم نے کیا کیا! پیر صاحب کی قبر اتنی قریب ہے اور ——"

"اور میں نے تمہارا منہ چوم لیا"

"ہٹو۔ اب مجھے پانچ پیسے کی نیاز دینی پڑے گی۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا"۔

"پانچ پیسے کیا، پانچ روپے دیدوں؟"

اتنا کہہ کے اُس نے مٹکا اپنے منہ سے لگا لیا، اور ایک سانس میں غٹاغٹ دودھ پیتی گئی۔

میں نے روک دیا۔

"میں بھی پیوں گا"

اُس کے ہونٹوں کے گرد دودھ کے بُلبُلے تھے۔

"اونہوں۔ اب نہیں۔ میرے پاس دس پیسے نہیں ہیں"

"مجھ سے لے لو"

"نہیں۔ تم یہ مٹکے کا دودھ پیو"

میں نے پیا۔

"اچھا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"تمہارے ہونٹوں سے اچھا ہے"

"مٹکا تمہارے سر پر پھوڑ دوں گی"

"نہیں مانتی ہو تو ایک دفعہ پھر آزما کے دیکھیں۔ لاؤ"

"ہٹو۔ جانے اُس وقت جانے میں کس خیال میں تھی"

"کس خیال میں؟"

اُس کے بے داغ چہرے پر دُھند سی آگئی، کہر سی چھا گئی۔ اُس نے اَبر آلود لہجے میں کہا "مجھے اپنے خاوند کی یاد آگئی تھی"

"تمہارا خاوند"

"ہاں وہ لام پر ہے، چار سال سے۔ بالکل تمہارے ایسا لگتا ہے۔ پہلے میں سمجھی وہی آگیا"

اُس کا سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے مٹکی اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ اَب اس کی آنکھیں نہ زمین پر تھیں، نہ آسمان پر، نہ مجھ پر۔

میں نے کہا "تو اُس بوسے پر میرا کوئی حق نہیں تھا"

وہ بولی " میں نے وہ بوسہ تمہیں نہیں دیا "
وہ گھوم کر چلی گئی ۔ نرگس شبنم بار تھی ۔
میں نے ہاتھ ہلایا " خدا حافظ "
اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا ۔ کچھ کہا بھی نہیں ۔ مٹکی اُس کے سر پر تھی ۔
بادل اُس کے قدموں سے لپٹے جا رہے تھے اور دُور نیچے جنگل میں
خوش الحان طیور گا رہے تھے ـــــ گیا پردیس سپاہی !

بہت دیر کے بعد میں پنجال کی چوٹی پر پہنچا ۔ سورج غروب
ہو چکا تھا اور نارنجی اُفق نیلگوں ہوتا جا رہا تھا ۔ تھوڑی دیر میں سیاہ
ہو جائے گا ۔ میں نے سوچا ، اب جلدی چلنا چاہیئے ۔
میں نے قبر پر پانچ روپے چڑھائے ۔ محبا ورحیت سے
میری طرف تکنے لگا ۔
میرا ملازم بولا " حضور آپ تو کبھی ـــــ ؟ خدا گواہ ہے میں
نے آپ کو کبھی اس قسم کی باتوں میں ـــــ یعنی ـــــ کچھ سمجھ
میں نہیں آتا سرکار "
میں نے کہا " میرا بھائی لام پر ہے ۔ میری بہن اُسکا انتظار کر رہی
ہے ـــــ چلو چلیں "

راستے میں، میں نے ملازم سے پوچھا 'تمہیں حوروں پر اعتقاد ہے؟'

علیا آباد کا جنگل بہت گھنا تھا، سیاہ، ڈراؤنا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ مرقبان اپنے دل کے خوف کو دُور کرنے کے لئے اونچی آواز میں پہاڑی گیت گانے لگے۔ گیت اداس تھے اور درد میں ڈوبے ہوئے اور مایوس زندگی کی ساری تھکن لئے ہوئے اور سماں ہی ایسا تھا، اور اُن کے قدم ہی ایسے تھے، اور خچروں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی صدا بھی ایسی تھی، یاس انگیز تاثر لئے ہوئے جیسے دنیا میں بہار کہیں نہیں ہے، اُمید کہیں نہیں ہے، مسرت کہیں نہیں ہے۔ ہر طرف سیاہی ہے، اُداسی ہے، اور کبھی نہ مٹنے والی پیاس ہے اور بھوک ہے۔

میں رائفل کو ہاتھ میں تھامے خچّر پر بیٹھا تھا۔

یکایک آگے سے، لیکن بہت قریب سے ایک نسوانی چیخ سُنائی دی۔ اور پھر ایک خچر کی خوفناک ڈنکار، اور پھر ڈھلوان پر ہزار ہا فٹ نیچے جیسے کوئی بھاری خچر گر رہا ہو، گرتے گرتے دُور جا رہا ہو، اور پھر دھم سے دُور نیچے گہرے پانی میں گرنے کی صدا۔ اور پھر خاموشی، نہ مٹنے والی خاموشی۔

میں نے خچر سے اتر کر رائفل چلائی۔
ملازم نے کہا "چڑیلیں ہیں صاحب۔ رات کے وقت یہاں انسانی آواز، اور وہ بھی عورت کی آواز۔ آگے مت جائیے صاحب، آگے چڑیلیں ہیں؛ حوریں نہیں صاحب، چڑیلیں"
میں نے کہا "تم میرے پیچھے پیچھے آؤ"
"یا پیر دستگیر"
"یا مولا۔ یا غوث الاعظم"
تھوڑی دُور جا کے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا قافلہ رکا پڑا ہے۔ ایک عورت بیہوش پڑی ہے۔ اک اور عورت اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ دو مرد صمٌ بکمٌ کھڑے ہیں۔ دو خچر چیل کے تنے کے پاس دبکے کھڑے ہیں۔ ایک مرقبان سسکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔
"کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔
مرقبان روتے روتے بولا "صاحب، بیچارہ خچر تھا۔ ابھی ڈیڑھ سو روپلے میں مول لیا تھا"
"کیا ہوا؟" میں نے درشتی سے پوچھا۔
"رانی صاحبہ خچر پر سوار تھیں۔ خچر ڈر کر، شاید کسی جانور سے ڈر کر بھاگا۔ رانی جی سڑک پر گر پڑیں۔ میرا خچر بھاگتا ہوا ڈھلوان سے نیچے لڑھک گیا۔ ہم نے بہت بچایا، مگر خدا کو یہی منظور تھا ۔۔۔ ہائے اللہ"

میں نے دوسری عورت سے پوچھا " بہت چوٹ آئی ہے ان کے ؟"
" نہیں بال بال بچ گئیں۔ جب خچر بھاگا، انہوں نے رکابوں سے پاؤں نکال لئے اور چھلانگ لگا دی۔ بہت ہوا تو کہیں موچ آگئی ہوگی۔ مگر ڈر کے مارے بے ہوش ہوگئی ہیں۔"
" کون ہیں یہ ؟"
" چھوٹی رانی جی ہیں۔ چندوک کے سردار کی بیوی۔ کالج سے پڑھ کے آرہی ہیں چھٹیوں میں "
میں نے بے ہوش عورت کو اٹھایا اور اسے اپنے آگے خچر پر لاد لیا۔ ملازم سے کہا وہ اپنا خچر دوسری عورت کو دیدے۔
" بنگلہ کتنی دور ہوگا ؟" میں نے ملازم سے پوچھا۔
" یہی کوئی آدھ میل اور ہوگا حضور"

رانی جی کے الجھے ہوئے بالوں میں رات کی رانی کی خوشبو آرہی تھی، اور ان کا بیضوی چہرہ میرے شانے پر تھا، اور ستواں ناک کے نازک نتھنے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے، مدھم بیہوش سانس سے۔ میں نے رانی جی کو شانے سے سہارا دیے رکھا۔ ایک ہاتھ میں خچر کی باگ تھی، دوسرا ہاتھ اُن کی بجید تنا سب کمر میں تھا، محض سہارا دینے کے لئے۔

رانی جی ہوش میں آنے لگیں۔ اُن کے منہ سے نکلا " چندوک "
میں نے کہا " یہ چندوک نہیں، یہ اُن کا بھائی مدھوک ہے"

" ہائیں! کون مدھوک ؟" وہ کلبلائیں۔
میں نے کہا " اب اسی طرح بیٹھی رہیئے۔ زیادہ کسمسائیں تو ہم دونوں وہیں جائیں گے جہاں ابھی ابھی آپ کا خچر گیا ہے"
" خچر روک دو میں اُتروں گی "
" اُتر کے کہاں جائیں گی آپ! آپ کا محل تو بہت دُور ہے۔ یہ تو علیا آباد کا جنگل ہے"
" تم کون ہو؟"
" میں ـــــ میں حکم کا یکہ ہوں"
" کیا؟"
" چڑیا کا غلام ہوں"
" کیا بکتے ہو۔ یہ ہاتھ یہاں سے ہٹا لو"
" میں وہ تاش کا پتہ ہوں جس سے ہاری ہوئی بازی جیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر میں نہ آتا تو صبح آپ کی لاش بھی اس جنگل میں نہ ملتی۔ اب کہیئے تو ہاتھ ہٹا لوں۔ محض آپ کو سہارا دینے کے لئے یہاں رکھا ہے، ورنہ مجھے آپ کی کمر سے کوئی عشق نہیں ہے"
" بڑے بیہودہ ہو جی تم"
" یہ خوشبو بہت اچھی ہے" میں نے اُن کی زُلف چُھو کر کہا " رات کی رانی مجھے بہت پسند ہے، بشرطیکہ مِل جائے۔ کس کالج میں پڑھتی ہیں آپ؟ رات کو سفر کرنے کا شوق کیوں ہوا آپ کو؟" اور وہ آپ

کے شوہر نامدار آپ کو لینے کیلئے کیوں نہیں آئے؟"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی؛ اور میرا کندھا اُس نے آنسوؤں سے
تر بتر کر دیا۔
"مر جائے وہ کمبخت، کیڑے پڑیں اُس کی جون میں، میں نے تار
دیا تھا پھر بھی مجھے لینے کے لئے نہیں آیا۔ ایسا بُرا جاگیردار ہے دوسر
تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں اپنے محل میں۔ میرا تو جی چاہتا ہے اُس کا
منہ جھلس دوں۔ ہائے، ہمارے ماں باپ نے ہمیں جیتے جی کیوں نہ
مار ڈالا۔ ہم لکھنؤ میں کیا بُرے تھے"
" ارے تو آپ لا مارٹی نیا میں ہیں!"
"آپ کو کیسے ــــــ؟"
"میری بیوی بھی وہیں پڑھتی ہے۔ اور ہر سال نینی تال جاتی ہے۔
آپ اُن سے ملی ہوں گی، مسز کنور بدھ پرساد سنگھ"
"ارے نیلامنی۔ نیلامنی۔ تم نیلامنی کے ــــــ"
" شوہر نامدار ہیں۔ آداب عرض"
"کنور بدھ پرساد سنگھ!"
"بدھو کہئے۔ اپنے کو سب پیار سے بدھو کہہ کے پکارتے ہیں۔ خادم
ہوں آپ کا۔ ذرا دوسرے شانے سے سر سے لگا لیجئے۔ یہ بیچارہ تو
تھک گیا ہے؛ گو پھول کا سا ہلکا جسم ہے آپ کا، مگر لکھنؤ کی نزاکت
کے ہم بھی قتیل ہیں"

علیا آباد کی سرائے میں آج کوئی دوسرا مسافر مقیم نہیں تھا۔ چوکیدار نے کھانے کے کمرے میں مومی شمعیں روشن کیں اور چھت کا فانوس آراستہ کیا، اور پھر سلام کر کے چلا گیا۔ ملازم نے ڈرائی شیمپین کی بوتل سامنے رکھدی۔ اور دو بلور کے کنول سامنے دھر دیے، اور پھر گھوم کر رخصت ہو گیا۔

"پیجیئے" میں نے بلور کے کنول شیمپین سے بھر کر رانی جی سے کہا۔

"میں تو نہیں پیتی ہوں"

"نینی تال آپ نہیں جاتیں؟"

"ہر سال جاتی تھی، اب کے قسمت کی ماری ادھر کشمیر میں چلی آئی"

"تو شیمپین آپ نے ضرور پی ہوگی۔ پیجیئے"

رانی جی کا بیضوی چہرہ، اُن کی ستواں ناک، سنہری رنگت، رسیلے ہونٹ، اور سر کے بالوں کی ٹیڑھی گھاٹیاں، وادیاں، مرغزار تنگ کمر کے نیچے پھیلے ہوئے تناسب کولھے، اور فرخ شفان کی ساڑھی کا شوخ بہاؤ، اک پہاڑی ندی کی یاد دلاتا تھا۔ ذہنی عمر کوئی دس برس کی ہوگی، ایم اے میں پڑھتی تھیں۔

پہلے پیگ کے بعد میں نے کہا "نینی تال کی بات کشمیر میں نہیں ہے۔

وہ خوبصورت ناچ گھر، وہ عمدہ مجلسیں، وہ سوسائٹی۔ آپ کہاں اس پہاڑ میں آ پھنسیں"

"قسمت، مائی ڈیر، قسمت" رانی جی نے جواب دیا۔

دوسرے پیگ کے بعد میں نے کہا "اگر آج سے تین سال پہلے میں نے تمہیں لامارٹی نیا میں دیکھا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہ چھین سکتی تھی"

رانی جی نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "تین سال پہلے" آہ! بدھو۔ کوئی اور ذکر چھیڑو۔ تین سال پہلے میری زندگی میں میرا محبوب آیا تھا۔ وہ لکھنؤ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس آ کے لگا تھا۔ خالص یورپین۔ مسٹر براٹ"

"تم نے اُس سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"ماں باپ نہیں مانے۔ سارے تعلقے کی ناک کٹ جاتی۔ ہائے ڈارلنگ براٹ!"

پانچویں پیگ کے بعد "رانی جی تم تو سچ مچ رات کی رانی ہو۔ تمہارا حسن رمبا ناچ کی طرح چنچل ہے، جیٹر بگ کی طرح نکیلا ہے۔ اور یہ تمہاری کمر کی تنگنائے۔ اک طرف سینے کی ہیجانی، اک طرف کولہوں کا پھیلاؤ اور بیچ میں یہ تنگ سی کمر، بالکل اس شیمپین کے گلاس، اس بلور کے کنول کی طرح۔ رانی تم بھی اک بلور کا کنول ہو"

چھٹے پیگ کے بعد رانی جی بولیں "نیلامنی، نیلامنی، میں اس عورت کو جانتی ہوں جو تمہاری بیوی ہے۔ اور پیارے بُرا نہیں ماننا، کہہ دو

برا نہیں مانو گے ڈارلنگ"

"نہیں اسمیں برا ماننے کی کیا بات ہے"

"نیلا منی، نیلا منی، تمہاری بیوی ہے لیکن اس سے بچ کے رہنا۔ کسی دن تمہیں زہر دے دیگی۔ وہ تمہاری دولت کے لالچ میں تم سے بیاہی گئی ہے۔ معاف کرنا ڈارلنگ مجھے تم سے ہمدردی سی ہو گئی ہے، ورنہ میں تم سے یہ سب کچھ نہ کہتی۔ اور پھر نیلا منی ——— نیلا منی کو نینی تال میں کون نہیں جانتا۔ معاف کرنا پیارے۔ میں نے نیلا منی کے بارے میں بڑی بری بری باتیں سُنی ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن آدمی آنکھیں کیسے بند کر لے۔ مجھے دیکھو، کوئی کچھ کہے، میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں۔ مکمل، کامل وفادار"

"میں بہت بدنصیب ہوں رانی جی۔ بہت بدنصیب" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا" مجھے تمہاری ایسی بیوی نہیں ملی۔ ڈارلنگ، تمہاری جیسی وفادار بیوی!"

"روتے کیوں ہو، بدھو" رانی میرے آنسو پونچھتے پونچھتے میری آغوش میں آن بیٹھیں "رو ؤ مت بدھو۔ قسمت ہی ایسی تھی، ورنہ ہم اس سے پہلے نہ ملتے۔ لو شیمپین پیو۔"

دسویں پیگ کے بعد شیمپین کی دوسری بوتل بھی لڑھکنے لگی۔ موم شمعیں ناچنے لگیں۔ رانی جی کی زلفیں کمر تک بکھر گئیں۔ بڑی بڑی آنکھیں گہری ہوتی گئیں۔ روتے روتے ہم دونوں نے تیسری بوتل کھولی۔

میں نے نیلامنی کی بے وفائیاں، اور رانی جی نے اپنے خاوند کی ہوسناکیا اور اس کے ظالمانہ سلوک کی کہانیاں بیان کیں۔ اور آخر میں ہم نے فیصلہ کیا کہ مرجائیں گے مگر اب کبھی ایکدوسرے سے جدا نہ ہوں گے"

"میں نیلامنی کو چھوڑ دوں گا"

"میں چندوک کا سر جھلس دوں گی"

"ڈارلنگ"

"ڈارلنگ"

"ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے رہیں گے"

"ہمیشہ ہمیشہ، ڈارلنگ"

علیاآباد کے جنگل میں ایسی رات کب آئی تھی۔ ایک بنگلہ تھا، ایک ہوس تھی، ایک تنگنائے تھی، جسے عبور کرنا تھا۔ عبور، عبور دریائے شور........!

صبح ہوئی تو جنگل پرندوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ صبح ہوئی تو ہم دونوں کو کچھ عجیب سا لگا۔ رانی جی کا چہرہ جو رات کو سبھنوی تھا اس وقت کچھ چپٹا چپٹا نظر آرہا تھا۔ نتھنے کچھ پھولے پھولے سے تھے اور اوپر کے ہونٹ پر سبزے کا ہلکا سا خط تھا۔ رات کو نہیں تھا،

اب کہاں سے آگیا۔ اور یہ آنکھوں کے نیچے گڑھے۔ اور یہ کمر کچھ ایسی تنگ نہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بہت عجیب سا معلوم ہوا۔ اور رانی جی کو بھی۔ انہوں نے ایک نظر میرے گھٹے ہوئے ماتھے کو دیکھا۔ پھر اُن کی نگاہیں میرے بڑے بڑے کانوں کی طرف گئیں، اور پھر گویا وہ نگاہیں وہیں آویزے بن کر لٹک گئیں، حتیٰ کہ شرم سے میرے کان لال ہو گئے۔ میرے کان واقعی گدھوں کی طرح بڑے بڑے ہیں۔ اور ہونٹ اتنے موٹے، حبشیوں ایسے۔ اور جبڑا اوپر کو اٹھا ہوا۔ رانی جی نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ پھر وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں

ناشتہ ہم دونوں نے خاموشی سے کیا۔ کسی نے بات نہیں کی۔

ناشتے کے بعد وہ اپنی ساڑی کا پلّو لیکر بیٹھ گئیں۔ کسی طرح چھوڑتی ہی نہیں تھیں اُسے۔

میں نے مسکرا کر کہا "تو آپ چندوک جائیں گی ضرور"

"ہاں!" انہوں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

اچھا ہے" میں نے خوشی خوشی جواب دیا "آپ میرے خچر لیجائیے کل تک واپس بھیجدیجئے گا۔ میں یہاں دو ایک روز ٹھیرونگا، شکار کے لئے۔ اور پھر ہم دونوں کا ساتھ جانا ٹھیک بھی نہیں۔ کوئی کیا کہے گا"

رانی جی نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولیں "گڈ بائی"

"گڈ بائی"

۴۵

سہ پہر کے قریب میں نے اپنے ملازم سے پوچھا "تم کہتے تھے نا کہ علیا آباد کے جنگل میں چڑیلیں بستی ہیں؟"

ایک گرجا، ایک خندق

اُس روز میرے احباب مجھے زبردستی گھسیٹ کے راج ہوٹل لے گئے۔
راج اور برین بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل ہیں۔ اور ہوٹل نئی تہذیب کے
مندر ہیں، اس لئے ہر شریف آدمی چھ بجے کے بعد یہاں نظر آتا ہے۔ یوں
تو میں بھی اچھا خاصا ہوٹل گرد ہوں، لیکن راج اور برین میں جانے سے مجھے
ہمیشہ بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کہنے کو تو یہ بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل
ہیں لیکن جتنی طوائفیں ان دونوں ہوٹلوں میں آپ کو نظر آتی ہیں، بمبئی کے
کسی دوسرے ہوٹل میں آپ کو نظر نہ آئیں گی۔ طوائفیں اور دلال ساتھ ساتھ
میزوں پر بیٹھے ہوئے آپ کو ملیں گے۔ اس میز پر آپ کا ڈس جی دامنگیر کا
خاندان دیکھیں تو اُن کی بغل والی میز پر آپ کو وہ پولش خاتون نظر آئے گی

جن کا ایک فلیٹ قولابے میں ہے اور ایک جھونپڑا جُوہُو ساحل پر، اور
جس کی فیس قولابے میں پچاس روپے ہے تو جُوہُو پر سو روپیہ اور تاج میں تین سو
سے پانسو تک۔ ایک طرف پرنس محبت جنگ شہزادی کرّو فر کے ساتھ تشریف
فرما ہیں تو اُن کے ساتھ والی میز پر امرتسر والی الماس بیگم ڈھری ہوئی ہیں۔
جنہوں نے لٹھے کے پھولدار پیٹی کوٹ پر ایک شفاف بنارسی ساڑی پہن رکھی
ہے۔ ساڑی سے بلاؤز تک جسم ننگا ہے، اور بغلوں کے پسینے سے نکہتِ بادِ بہاری
کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ بلکہ اکثر تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی میز پر راجے اور رانیاں
اور طوائفیں اور ان کے دلّال اور تاجر پیشہ لوگ اور فلم سٹار نظر آ جاتے ہیں یعنی
ایک ہی وقت میں اتنی دوکانیں نظر آ جاتی ہیں کہ طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔
آدمی سوچتا ہے کہ ہم تو تفریح کو آئے تھے، یہاں پھر کمبختوں نے بازار کھول دیا۔
ہر شخص جھپٹا مارنے کو بیٹھا ہے۔

جو عورت ہے رنگ و روغن سے اسقدر خوبصورت بنی بیٹھی ہے کہ
اس کی فطری نسائیت تباہ ہو گئی ہے۔ جو مرد ہے وہ اسقدر اکڑا اکڑا بیٹھا ہے
گویا ابھی لانڈری سے دُھل کر آ رہا ہے۔ یعنی، فطری آسودگی اور شائستگی
اور وہ معصومانہ چہل، جن سے ذوقِ مجلس کی تخلیق ہوتی ہے، یہاں غائب ہیں
یہ نہیں کہ مجھے طوائفوں سے کوئی خاص کد ہے یا یہاں پر شرفا نہیں آتے لیکن
صاحب کوئی بات بھی تو ہو۔ ہر عورت نے وہی شرحتی لگا رکھی ہے، وہی غازہ،
وہی کاجل کی لکیر، سارے ہوٹل میں گھوم جائیے آپ کو ایک مرد ایسا نہیں ملیگا
جس نے ڈو روز سے شیو نہ بنائی ہو۔ اور عقلمند اتنے ہیں کہ دماغ پر سوال سے

جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں، اور کوئی اُنہیں صاف کرنے کی کوشش نہیں کرتا؛ لکھنؤ کے بیش قیمت غرارے آپ دیکھیئے، پنجاب کی سٹائیلش شلواریں، اور پارسنوں کی شفاف ساڑیاں جو جسم پر کلڑ لیدر کی طرح اسطرح منڈھی ہوتی ہیں گویا ماں کے بطن ہی سے ساڑی باندھ کے آئی تھیں۔ لیکن بس اس کے بعد کچھ نہیں۔ آپ کسی موضوع پر ان سے بات کیجئے (ما سوائے ایک)، پارسن ہوگی تو کہے گی "سول چھیے"، یو۔پی۔ کی ہوگی تو بڑی تمکنت سے "خوب!" اور پنجابن ہوگی تو مسکرا کر کہے گی "ہلا جی!" اور اس کے بعد آپ سر پکڑ کر رو دیئے، دھاریں مارئیے، چیخیئے، چلّائیے، کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔ مرد اکڑے بیٹھے رہیں گے؛ عورتیں زیادہ ہنسیں گی نہیں (کہیں چہرے پر شکن نہ آجائے)، روئیں گی بھی نہیں۔ پیسٹری کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے ایسے پکڑیں گی گویا پیسٹری کا ٹکڑا نہیں، کیکڑا کھا رہی ہیں۔ شیری کا گلاس اس نزاکت سے اٹھائینگی گویا اس کے بار سے کمر دوہری ہوئی جارہی ہے۔ اور آپ انکے شوہر سے ملیئے تو دو من کی لاش ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کس دنیا کی مخلوق ہیں یہ لوگ۔ سیاست، ادب، کلچر سے تو خیر یہ لوگ بے بہرہ ہیں لیکن اس کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر بھی (سوائے ایک کے) انکے دماغ میں برقی رَو نہیں دوڑتی، کنکشن نہیں ہوتا۔ یہ لوگ امریکی اور انگریزی ٹائی کا فرق نہیں جانتے۔ جٹربگ اور جٹرڈمبا میں تمیز نہیں کرسکتے۔ ال جانسن اور بسی نا تر اکے گانے کا فرق معلوم نہیں۔ شفان اور جاپانی

نقلی ریشم کی پہچان نہیں۔ بہت یہ بھی نہیں جانتے کہ ریشم کا کپڑا ریشم کے کوئے سے تیار ہوتا ہے یا گھوڑے کے منہ سے نکلتا ہے۔ مرد ہیں کہ اپنی بیوی کا نام نہیں بتا سکتے اور عورتیں ہیں کہ اپنے بچوں کی صحیح تعداد بتانے سے قاصر ہیں۔ ہاں برائی جس کی بھی چاہیے آپ سن لیجئے۔

"ہر میجسٹی گھوڑی بہت اچھی ہے" آپ نے کہا "آج تک کوئی ریس نہیں ہاری"۔

وہ سوں سمجھے؟ ارے کیا بات کرتے ہو یہ تو Trick ہے۔ پنٹرز کو دھوکا دینے کا۔ اگلی ریس میں دیکھنا۔ مجھے ٹپ ملا ہے ٹپ (کان میں) جنگل واس بکواسا کے جاکی نے بتایا ہے اب کے وہ ہر میجسٹی کو کھینچ لیں گے! سالے ریس کی اور بات ہے۔ ہم تو بمبئی میں پانچ پشت سے ریس کھیلتے آئے ہیں۔ لاکھوں روپے ہار دئے۔ I know it inside out. سالا سوں بات کرے ہے سمجھے؟"

ریس کی بات ختم ہو گئی۔ سامنے سے ایک پنجابی پائلٹ گذرا۔ موٹی پارسن نے اُسے حریصانہ نگاہوں سے تاکتے ہوئے کہا "فوج میں سارے کے سارے پنجابی نظر آتے ہیں۔ مگر ایک بات ہے، جوان اور تگڑے ضرور ہوتے ہیں۔ اور خوش شکل اور خوش پوش بھی"

"خوب!" لکھنؤ کے غرارے نے طنزاً کہا۔ اور اس کے بعد جو چہکنا شروع کیا تو دس منٹ تک پنجابی پائلٹ کو اور اس کو وطن کو وہ رگید وہ رگیدا کہ بیچارے کی پتلون بھی اتار ڈالی۔

اس کے بعد موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے یار لوگوں نے مہارانی شام بہار اور اُن کی دو جوان لڑکیوں کو تاکا جو ابھی ابھی اپنے سوئیٹ سے نکل کر ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔ خوبصورت لباس، خوبصورت موتیوں کے ہار۔ وہ تینوں فرش پر اس طرح بے آواز باسلیقہ بارعب انداز میں چل رہی ہیں جیسے خود نہ چل رہی ہوں بلکہ کوئی بیرہ اُن کے قدموں کو طشتری میں رکھ کے آگے لا رہا ہو۔

ہیرے بیچنے والے سیٹھ گھنشام داس جوہری نے کہا "مہارانی شام بہار کے گلے میں جو ہار آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہماری دوکان کا ہے۔ ساڑھے سات لاکھ میں خریدا ہے مہارانی نے۔ بڑی اچھی ہیں مہارانی جی؟"

"ہلا جی؟" شلوار بولی "اس کے ایڈی کانگ سے پوچھیے۔ بڑھیا ہو گئی ہے پھر بھی اتنے اتنے جوان ایڈی کانگ رکھ چھوڑے ہیں۔ میرا بھائی اجیت سنگھ اس کی نوکری چھوڑ کے چلا آیا۔"

"کیوں؟"

اُس کا اِس کی لڑکی کے سنگ پیار ہو گیا تھا، وہ جو ہے نا چھوٹی والی۔ ہی ہی ہی!" وہ زور سے ہنسی۔ پھر ایک دم چپ ہو گئی (زیادہ ہنسنے سے چہرے پہ شکن پیدا ہو جاتے ہیں بحوالہ میکس فیکٹر)۔

ایسی دو چار خوبصورت پارٹیاں دیکھ چکنے کے بعد میری تو راج یا برین ہوٹل میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن احباب پیچھا نہیں

چھوڑتے تھے۔ دراصل ہم لوگ چار بجے سے سکاچ وھسکی کی تلاش میں تھے۔ لیکن کم بخت کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ ایک تو جنگ کا زمانہ دوسرے بلیک مارکیٹ کی گرانی، تیسرے امریکی سپاہیوں کی آمد۔ خوبصورت سے خوبصورت عورت مل سکتی تھی بمبئی میں، اور وہ بھی نہایت سستی، لیکن سکاچ وھسکی کسی قیمت پر دستیاب نہ ہوتی تھی۔

"ہم راج نہیں جائیں گے۔ وہاں کوئی ہمارا قرضخواہ مل گیا تو، اور اگر اس نے اپنی ہنڈی کا تقاضہ کر دیا تو؟"

"اسے کوئی نہیں ملیگا"

"اور اگر وہاں ورلی والی بھونیشوری مل گئی؟ وہ تو ہر روز شام کو وہاں جاتی ہے، کبھی کسی کنور صاحب کے ساتھ، کبھی کسی امریکن کے ساتھ، کبھی فلمی ادیب کے ساتھ۔ اور اگر اس نے وہ ڈیڑھ سو روپے طلب کئے جو اس کے ہماری طرف لگا یا ہیں، تو پھر؟ اور اگر اس نے راج ہی میں چپل اتار لی بڑی بد ذوق گھاٹن ہے وہ۔ لحاظ نہیں کرے گی"

"اسے تو چلے گا یا باتیں بنائیگا بیٹھا بیٹھا"

"اور پھر سکاچ تو وہاں کبھی نہیں ملے گی۔ خود راج میں رہنے والے گاہکوں کو نہیں ملتی۔ بیچارے شہزادے اور جوہری اور چاندی کے سٹے اور سیاستدان جن کے حکم کا سکہ دنیا میں چلتا ہے، وہی آسٹریلین وھسکی پیتے ہیں جس سے گھوڑے کی لید کی بو آتی ہے، یا ساؤتھ افریقین وھسکی جسے سونگھ کر منٹو کا افسانہ "موتری" یاد آتا ہے"

اب کے اُنہوں نے مجھے شانوں سے پکڑا، اور اٹھا کے کار میں ڈال دیا۔

وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ راج میں نہ سکاچ وھسکی ملی نہ انگلش جن، نہ فرنچ شیمپین۔ ہمارے ساتھ کی بیچاری عورتوں کے لئے شیری تک تو ملی نہیں۔ اور یہ بیچاری ہندوستانی عورتیں، عفت مآب خواتین ویسی گملٹ کیا پیتیں۔ نشہ ہی نہیں ہوتا جس سے اور جس چیز سے نشہ نہ ہو وہ بھلا ہماری شریف عزت دار عفت مآب ستی ساوتریاں کیوں پینے لگیں۔ ایک تو پیسے خرچ کرو، پھر شراب پیو اور اُس پر راج میں یوں کھلے بندوں، اور اُس پر بھی نشہ نہ ہو ____ لہٰذا ہر ایک نے ایک ایک گلاس ٹماٹو جوس کا پیا۔

عین اسی وقت مس سبحان ہماری میز کے سامنے سے گزر گئیں سپید شلوار، کاسنی قمیص، کاسنی دوپٹہ، کاسنی ناخن، کاسنی لپ اسٹک ہماری طرف گھورتی ہوئی گزر گئیں۔ میں نے تعظیماً اشارہ کرنا چاہا مگر وہ بجلی ____ کاسنی بجلی کی طرح چمک کر گھوم گئیں۔ مس سبحان کے بارے میں ضمناً عرض ہے کہ اُنہیں دیکھ کے یاروں کو چاہے عورت کا دھوکا ہوتا ہو، بندے کو صرف چوہے دانی کا شبہ ہوتا ہے۔ اب ایسا کیوں ہوں ہوتا ہے، اس کی توجیہہ مجھ سے ممکن نہیں۔ بس ہوتا ہے (لبعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے دوسرے روز میرا ذکر ان الفاظ میں کیا "وہ کل راج میں بیٹھا شراب پی رہا تھا، ایک اینگلو انڈین چھوکری

کے ساتھ، اور میں تو راج میں بال بنوانے گئی تھی")

راج سے نکل کے ہم لوگ برین آئے۔ یہاں دوسرے
درجے کے لوگ آتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار
سے اوپر اور دو لاکھ سے کم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ والیانِ ریاست نہیں
آسکتے، نہ وہ مہاراجگمار جن کی ریاست کا قطر تین میل سے کم ہوتا ہے،
اور جو انٹر کلاس میں سفر کرتے ہوئے بھی سوچتے ہیں کہ ریاست کا خزانہ
اس کا بل کہاں سے ادا کرے گا۔ اس ہندوستان جنت نشان میں
ابھی تک سینکڑوں ایسے راجے اور رانیاں ہیں جن کے لئے بمبئے میں
کاسموپالیٹن ہوٹل ہی سوائے اور کلیرج سے بڑھ کے ہے۔

برین میں رم دستیاب ہوسکتی تھی اور سوسن اور کاٹ ۹۶۵
اور یہاں گوانی آرکسٹرا تمام انگریزی فلموں کی دھنیں یکے بعد دیگرے
بجائے جاتا تھا۔ اور ہندوستانی عورتیں، غرارے، شلواریں اور ساڑیاں
پہنے ناچ رہی تھیں۔ اور امریکن اور ٹامی اور سودیشی کپتان اپنی محبوباؤں
کے اس طرح ساتھ ساتھ چپکے ہوئے تھے گویا انہیں گھول کے پی جائیں گے
خدا جانے آدمی اتنا پیاسا کیوں ہے۔ دن رات تو عورت مرد کا ساتھ
رہتا ہے، اس کے بعد بھی اس قدر پیاسا ہے، اس قدر ٹھرڈ لا ہے،
یہ اس قدر ندیدہ کیوں ہے؟ کہیں دس میل دور سے عورت نظر آجائے
یہ وہیں کھڑا ہو کے کتے کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا شاید

یہ بیچارہ ہندوستانی ہی اس مرض کا شکار ہے، اب بیشتر ٹامیوں اور امریکیوں کو دیکھ کے خیال ہوتا ہے کہ یہ لعنت ساری دنیا میں ہے۔ یعنی عورت کو دیکھتے ہی ایک ایسی پھوہڑ بے حیا ننگی بھوک سی چہرے پر نظر آنے لگتی ہے کہ آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یا تو خود پاگل خانے چلا جائے اور یا ان سب کو پاگل خانے بھیجدے، جہاں انھیں برومائیڈ کھلا کھلا کے ان کا دماغی توازن درست کیا جاسکے۔ مگر کچھ ہوگا نہیں۔ یہ سب سوچنا بیکار ہے۔ آدمی ابھی تک تنو مند جنگلی، وحشی اور ناترقی پسند ہے۔ وہ ابھی تک دو قسم کی بھوک نہایت شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ایک تو پیٹ کی بھوک اور دوسری جنس کی بھوک۔ آپ اس کی یہ دونوں چیزیں پوری کر دیجئے، اور پھر چاہے اسے گولی مار دیجئے۔ ماہر جنگ اسی لئے تو بھرتی کے وقت ان دونوں باتوں کا خیال رکھتے ہیں، اور اس کے بعد انہیں گولی مار دیتے ہیں۔ یہ اونچی اور بلند و بالا مہذب زندگی Higher life کی چیخ و پکار سب بکواس ہے۔ برین ہوٹل کے ناچ گھر میں سب لوگ یا تو شراب پی رہے تھے یا ناچ رہے تھے، یا یورنیل میں پیشاب کر رہے تھے اور ہر ایک کے ماتھے پر ایک خوابگاہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کم از کم میری نگاہوں میں سینکڑوں سونے کے کمرے کھل رہے تھے تنگ کمرے، کشادہ کمرے، ٹیڑھے کمرے، خوشبودار کمرے، بدبودار کمرے، فلیٹوں کے کمرے، بنگلوں کے کمرے، جھونپڑوں کے دروازے یا ساحل کی ریت۔ ایک مرد، ایک عورت، ایک بوتل،

ایک پلنگ۔ کسقدر پست ہے انسانی مسرت کی معراج ابھی۔ چھ ہزار سالہ
تہذیب کی معراج ابھی۔ پلنگ کی اونچائی سے بلند نہیں ہوئی۔ چھ ہزار
سال میں تین فٹ سے اوپر نہیں اٹھی۔ اور ابھی اسے چاند تک پہونچنا ہے
تاروں کو چھونا ہے۔ یہ شاعر بھی خوب بیکار کی سوچتے ہیں، چاند اور
تاروں کی خبر لاتے، اور صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں تک جنسی رفعت کا
تعلق ہے ایک کتے، ایک کاک روچ اور انسان میں کوئی فرق نہیں!

برین سے مایوس ہوکے لوٹے تو صلاح ٹھہری کہ جُوہُو چلا
جائے۔ وہاں ایک فرانسیسی داشتہ نے ہوٹل کھولا تھا۔ وہ پہلے قولابہ
میں اپنا دھندا کرتی تھی۔ اور جنگ کا زمانہ تو آپ سمجھئے بوم پیریڈ ہوتا ہے
دُو سالوں ہی میں اُس نے اتنا کما لیا کہ اُسے جُوہُو پر ایک اپنا ہوٹل
کھولنا پڑا۔

"وہاں سکاچ ضرور مل جائے گی"

میں نے کہا "اب مجھے تو چھٹی دو۔ اب میں جُوہُو نہیں جاؤں گا۔ اور
نہ سکاچ پیوں گا۔ اور اس فرانسیسی چڑیل کی صورت دیکھ کے تو مجھے
آگ لگ جاتی ہے۔ کم بخت ایسی ماہر نگاہوں سے دیکھتی ہے معلوم
ہوتا ہے آپ کی جیب کے سارے نوٹ گن رہی ہے۔ میں نہیں جاؤنگا
اب کہیں۔ تم مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

"کیا کروگے تم اکیلے؟"

"کسی سے ملاقات کا وقت قریب ہے۔"

یہ ہمارے ساتھ جو لونڈیاں ہیں تمہیں پسند نہیں کیا ؟"
میں نے ہاتھ جوڑے ، پاؤں پڑا ، اگلے اتوار کا وعدہ کرکے اُن سے رخصت ہوا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا ، اس لئے سمندر کے کنارے ہو لیا۔ اور دُور تک ٹہلتا چلا گیا۔ ٹہلتا ٹہلتا باب الہند پہنچ گیا۔

یہاں ایک لڑکی جیسی عورت کا سا لباس پہنے باب الہند کی بلند و بالا چھت کے نیچے کھڑی گا رہی تھی۔ اور ناچ رہی تھی ، اور اس کے گرد پارسیوں ، ٹامیوں ، امریکیوں اور متوسط طبقے کے ہندوستانی طلباء کا جمِ غفیر تھا۔ لڑکی پتلی چھریری متناسب الاعضاء اور سپید رنگ کی تھی۔ چمکتے ہوئے دانت ، اوپر سیاہ آنکھیں ، بالکل سیاہ ، اور بےحد شوخ ، شرارت سے بھری ہوئی۔ اور اوپر سیاہ گھنگھریالے بال ، لانبے اور گھنگھریالے۔ ہر زلف ایک ناگن لہرائی ہوئی ، اور ناچتے ناچتے متبسم لبوں میں کوندے کی سی لپک ، اور یکایک اُن زلفوں کا جھٹک جانا ، جیسے کائنات پر گہری بدلیاں چھا گئی ہوں ، اور سپینی گیت میں موری نغمے کا وحشی لہراؤ۔ اُس سنگیت کے اُفق پر اور اُس عورت کے جسم میں مشرق و مغرب دونوں مل گئے تھے۔ اور جب بھی کوئی دو متضاد چیزیں ملتی ہیں ایک نئی چیز بنتی ہے۔ اس لحاظ سے کارمن بالکل نئی تھی۔ نمی ، اچھوتی ، اک اچنبا ، اک معجزہ۔
گیت ختم ہو گیا۔ ناچ بند ہو گیا۔ نغمہ منجمد ہو کے عورت بن گیا۔ ناچ رک کے

جوانی بن گیا۔ کارمن نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور تتلاتے تتلاتے کہا
" اک پی شا سی نور"
سی نور ایک پی شا۔
اور چاروں طرف سے سکّوں کی بارش ہوگئی۔ ایک سکّہ میں نے بھی دیا۔ اس کی پتلی پتلی گرم انگلیاں میری انگلیوں سے مس ہوکے "سکّے" کو لے گئیں۔ کہیں دُور ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ کہیں سے اس کا جواب نہ آیا۔ سکّہ چلا گیا، مگر جواب نہ آیا۔ کچھ عجیب سی مایوسی تھی، جیسے توازن قائم نہ رہا ہو۔ ایک سکّہ میں نے دیا، ایک سکّہ اُس نے لیا۔ بات ختم ہوگئی۔ ہو جانی چاہیئے تھی مگر مجھے احساس ہوا جیسے بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ انگلیاں بہت کچھ کہہ سکتی تھیں، لیکن انگلیوں میں اور نگاہوں میں مطابقت نہ تھی۔ اور جب تک مطابقت نہ ہو برقی رو پیدا نہیں ہوتی بیچ ہی میں شارٹ سرکٹ ہو جاتی ہے۔

میں ٹہلتے ٹہلتے آگے بڑھ گیا۔ باب الہند سے بہت دُور آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر تک میں نے باب الہند کو اور کارمن کو اور اس جمِ غفیر کو اپنے ساتھ ساتھ چلایا، ساحل کی ریت پر، پھر باب الہند اور وہ جمِ غفیر غائب ہوگیا۔ پھر دُور تک کارمن میرے ساتھ ساتھ ساحل کی لہروں پر چلتی رہی۔ پھر وہ اوپر اٹھکر شفق کے بادلوں میں اڑنے لگی۔ پھر تاروں میں جاکے غائب ہوگئی۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ اور لہریں عجیب سے راگ گانے لگیں اور تارے پلکیں جھپک جھپک کے مجھے

مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ اور ہوا اپنی خنکی میرے نتھنوں تک لائی۔
اور میری گردن کے گرد گھومنے لگی۔ اور میں نے کوٹ کے کالر اوپر کرلئے
اور مڑکر گھر کا رُخ کیا۔

ایک پیشا سی نور
سی نور ایک پی شا
ایک پی شا سی نور

اُس نے مسکرا کر آج بھی ایک سکّہ میری کانپتی ہوئی انگلیوں سے
لے لیا۔ آج باب الہند آتے ہوئے اور کارمن کا ناچ دیکھتے ہوئے
مجھے دسواں روز تھا۔ یہی کارمن، یہی سپینی نغمہ، یہی باب الہند کی
بلند و بالا چھت، یہی ہجوم۔ اس ہجوم میں چند چہرے ایسے بھی تھے جو
میری طرح ہر روز آتے تھے۔ اس ہجوم سے پرے پتھر کی دیوار تھی
اور اُس سے پرے سمندر، اور سمندر میں دخانی جہاز اور چھوٹے اگن بوٹ
اور بڑے ڈسٹرائر، اور شہریوں کی سیر کیلئے ڈیزل آئل سے
چلنے والی موٹر کشتیاں جن کے انجنوں کا دھیما دھیما شور یہاں تک
پہنچ رہا تھا۔ ناریل بیچنے والا سر پر ٹوکری اُٹھائے ناریل لادے۔
ادھر سے گذرا اور ٹھٹھک کے رہ گیا۔ ہر روز اسی طرح ٹھٹھک کر رُک جاتا،

گویا ہر روز اُسے اک نیا احساس ہوتا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کی پتلیاں حیرت سے پھیل جاتیں۔ ایک "سفید رنگ کی میم" باب الہند کی چھت کے تلے ناچ رہی تھی؛ اور یوں سرِراہے ساری دُنیا کے سامنے۔ پہلی بار وہ ایک سفید فام عورت کو یوں راس دھاریوں کی طرح بھیک مانگتے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی، اور وہ حیرت سے تکتا، پھر سر جھٹک کے آگے بڑھ جاتا۔

کھوپرے کا پانی، ٹھنڈا میٹھا مزیدار، لیمن جوس سے زیادہ مزیدار کھوپرے کا گودا، نرم ملائم، ملائی کی طرح ریشمی اور خنک۔

ریشمی اور خنک، جیسے کارمن کا جسم!

ایک پی شاسی لور۔

کارمن میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے چیلنج کرتے ہوئے ہونٹ بالکل میرے ہونٹوں کے سامنے تھے۔ میں نے ایک "سکہ" اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں میں اٹکا لیا۔ کارمن نے اپنے ہونٹ ایک جھٹکے سے ہٹا لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "سکہ" اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں چلا گیا۔ گیت ختم ہو گیا۔ زمین و آسمان کی گردش رُک گئی۔ ساحل گھومتا گھومتا تھم گیا۔ لہریں سرگوشیاں کرتی کرتی چپ ہو گئیں، اور وہ ایک امریکی فوجی کے ساتھ چلی گئی۔

وہ شام کو ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ سیر کرنے جاتی تھی، کوئی گنجا مڑی ہوئی ناک والا پارسی، کوئی غلیظ دانتوں والا ٹامی، کوئی چقندر کی طرح سُرخ امریکی، اُسے اپنی گاڑی میں سوار کرا کے لیجاتا۔ اُس کی مسکراہٹ کہتی کارمن تیرے ساتھ بھی جا سکتی ہے۔ اُس کے ہونٹ ہمیشہ میرے ہونٹوں کے سامنے آ کے ہجوم میں سب کے سامنے اس قدر قریب ہو کے مجھے چیلنج کرتے، اور اس کی آتشیں سانس کی لَو اک شعلے کی لپک کی طرح میرے رخساروں سے چھو جاتی۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم سی جھجک تھی، اک بعید شرمیلی نوزائیدہ کلی کی طرح نازک اور معصوم سی جھجک جو اس سے پہلے کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ ایک ایسی بے نام سی جھجک جو جھجک کم تھی اور خلش زیادہ تھی، جیسے میں نے اس سے پہلے بھی کارمن کو کہیں دیکھا ہے، شناسا ہے پہچانا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہاں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ راج کے عقب میں دُور دور تک وہ علاقہ تھا جہاں فلیٹوں میں اجنبی دیس کی اجنبی عورتیں رہتی ہیں۔ وہیں ایک فلیٹ میں کارمن بھی رہتی تھی۔ کئی بار میں اُس کے فلیٹ تک گیا اور پھر دستک دیئے بغیر لوٹ آیا۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کاہش کیا ہے، یہ جھجک کیوں ہے، یہ خلش کس لئے ہے؟

اور پھر آج بہت دنوں کے بعد میں نے ہمت کر کے اُس کے دروازے پر دستک دیدی۔ کارمن نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ مجھے دیکھ کے چونک گئی۔ اُس کی نگاہیں جیسے مایوس سی ہو گئی ہوں، جیسے بجھ سی گئی ہوں۔ میں نے اُن میں درد کی اک تڑپتی ہوئی زنجیر دیکھی، جو دوسرے لمحے میں غائب تھی۔

دوسرے لمحے میں اُس نے کہا "اندر آ جاؤ۔ اور وہ خود یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی دوسرے کمرے میں "میں لباس تبدیل کر آؤں"

جب وہ لباس تبدیل کر کے آئی تو بالکل مختلف تھی۔ گاؤن ٹخنوں سے بھی نیچا تھا، جس سے اُس کی خوبصورت ٹانگیں چھپ گئی تھیں۔ اُس نے بال سپینی شرفاء کی عورتوں کی طرح سنوارے تھے اور اُن میں چاندی کا مینٹلا لگایا تھا اور اُس پر ایک باریک سیاہ دوپٹہ ٹانکا تھا جو چاندی کے لہریئے سے جھلملا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک غائب تھی، اور آنکھیں گہری سیاہ، اور سوئی سوئی سی، اور خطرناک جیسے کسی طوفان کو اپنی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے ہوں۔

"آخر تم بھی آ گئے"

میں نے کہا "میں صرف گانا سُننے کے لئے آیا ہوں"

"ایک پی شاسی تو"۔ وہ ہنسی

میں نے کہا "تم پی شا کیوں کہتی ہو، ..... "

"ایک لوپیا سی نور" وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی "ایک لوپیا سی نور"

"لوپیا نہیں روپیہ"

"نہیں۔ میں تو لوپیا کہونگی، ورنہ وہی پی شا کہوں گی۔ بولو کیا کہوں؟ اُس نے مجھے ڈپٹ کر کہا۔

میں نے کہا "اچھا تو لوپیا کہو، مگر پی شامت کہو"

اُس نے میری ٹھوڑی چھو کر کہا "تم بڑے اچھے لگتے ہو۔ بالکل اسس گدھے کے بچے کی طرح جس پر میں ایلی کانتے میں سواری کیا کرتی تھی"

"تم ایلی کانتے کی رہنے والی ہو؟"

"ہاں۔ ایلی کانتے میں میرے ماں باپ کی بیکری تھی۔ اتنی اچھی ڈبل روٹی بناتا تھا وہ۔ اور میری ماں کے ہاتھ کے کرسمس کے کیک، بارسلونا تک جاتے تھے۔ اور ایلی کانتے کے بازار کا فرش پتھروں کا بنا ہوا تھا، ٹیڑھے میڑھے کھردرے پتھر، نیلے پتھر جن پر ہمیشہ قدموں سے چپ چپ آواز پیدا ہوتی تھی، اور جو بارش میں جیڈ کے ٹکڑوں کی طرح چمکتے تھے۔ ہائے ایلی کانتے! ہماری دوکان اُسی بازار میں تھی، اور اسس دوکان کے اوپر ہمارا گھر تھا جہاں میں اور میرا باپ اور میری ماں اور میرے دونوں بھائی کو سترے اور گارسو رہتے تھے۔ اتوار کو ہم لوگ گرجا سے فارغ ہو کے گرونو کے سبا میں جاتے"

"گرونو کا سبا"

"ہاں" اُس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھدیا اور کھڑکی جو کھُلی تھی اور جس میں سمندر کا ساحل اور ساحل سے پرے اگن بوٹ اور جہاز اور ڈسٹرائر نظر آرہے تھے۔ اور وہ اُس کھڑکی کے باہر دیکھتے دیکھتے بولتی گئی۔

"گرونو کا سپا اِلی کانتے سے آٹھ میل دُور ہے۔ ہم گدھے کے بچوں پر سوار ہوکے جاتے تھے، اور ہمارے ماں باپ گدھوں کی سواری کرتے، اور ساتھ میں ڈبل روٹیاں اور مکھن اور کیک اور سینڈوچ ہوتے، اور وہ ہسپانی شراب جو صرف سپینی انجیروں سے کشید کی جا سکتی ہے" کارمن نے اپنے ہونٹوں سے سیٹی بجائی۔

"ہم لوگ دن بھر گرونو کے سپا میں رہتے۔ وہاں کے گرم چشموں میں نہاتے اور ساحل کے کنارے کنارے رنگین چھاتوں کی دنیا میں سو جاتے .... میری ماں بہت اچھا تیر سکتی تھی۔ وہ گوشت کے تکّے اور سور کی کباب زیتون کے تیل میں تل کے بناتی۔ ہائے! وہ خوشبو ابھی تک میرے نتھنوں میں باقی ہے ...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام کیا ہوگا" میں نے مسکرا کر کہا "میں تو ایک چھوٹا سا گدھے کا بچہ ہوں"

اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میرے گدھے کا نام ٹوٹو تھا۔ میں تمہیں بھی ٹوٹو کہوں گی۔ کیوں ٹوٹو؟"

میں گدھے کی طرح چلّانے لگا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر ایکدم

چپ ہوگئی۔ بولی "میں کتنی بے وقوف ہوں۔ تم سے بالکل ایک سینٹ کا سا، ایک گاہک کا سا سلوک نہیں کر رہی ہوں۔ اچھا میرے اچھے ٹونو بتاؤ کیا پیوگے، شراب یا ٹماٹو جوس؟"

"شراب"

"کونسی؟"

"کونسی ہے تمہارے پاس؟"

"میرے پاس خالص سپینی شراب ہے جو میرے ہونٹوں سے تیار ہوتی ہے"

"کوئی دوسرا برانڈ بتاؤ"

"کیوں؟"

"میں نے تم سے کہدیا ہے میں صرف گیت سننے آیا ہوں"

"کیا میں خوبصورت نہیں ہوں، کیا جوان نہیں ہوں، میں؟" وہ اپنا گون ٹخنوں سے اوپر لیجانے لگی۔

"رہنے دو" میں نے اُسے لجاجت سے کہا "میں تمہارے حسن کی فہرست نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم سے گاہکوں کا سلوک نہیں ایک دوست کا مرتبہ مانگتا ہوں، چند گھنٹوں کے لئے سہی"

"اچھا تو میں تمہیں صرف ٹماٹو جوس پلاؤں گی آج"

میں نے بھی پیا اُس نے بھی۔ پھر وہ مجھ سے ذرا الگ ہو کے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی "ٹونو"

"ہاں"

"میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ تمہاری آواز سُنی ہے۔ تمہیں پہچان رہی ہوں"

"اپنی بھی یہی حالت ہے"

"لیکن اندازہ نہیں ہوتا ٹونو"

"نہیں ہوتا کارمن۔ یہ چھوٹی سی دنیا بہت بڑی ہے کارمن۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی نہیں پہچانتے، اور کبھی نہ جانتے ہوئے بھی پہچان لیتے ہیں"

"میرا خیال ہے تم میرے بچپن کے گدھے کے بچے ہو"

"تمہارا خیال صحیح ہوگا کارمن۔ اس وقت کوئی اچھا سا سپینی گیت سُنا دو اور ساتھ اس کا مطلب بھی بتا دو"

اُس کی آنکھوں میں پھر وہی کرب کی لہر پیدا ہوئی اور مر گئی۔ پھر وہ ہنس کر بولی "میں تو ہمیشہ گندے گیت گاتی ہوں۔ تم اُن کا مطلب سمجھ کے شرما تو نہ جاؤ گے"

میں چپ ہو رہا

وہ اُٹھ کے سامنے میز تک گئی اور وہاں سے گتار اٹھا لائی۔ اور سامنے کرسی پر بیٹھ کے اُسے بجانے لگی۔ بجاتے بجاتے بولی "اچھا تو سنو، تمہارے لئے ایک پرانا گیت گاتی ہوں۔ صرف تمہارے لئے۔ اک صاف ستھرا گیت۔ ایک معصوم بچے کی طرح بھولا بھالا گیت گاتی ہوں میرے چھوٹے سے سگرٹ کیس

آج تم بالکل خالی ہو
کل اتوار ہے لیکن
کل تمہیں بھر دوں گی (سگرٹوں سے)
آج میرے پاس صرف دو سگرٹ ہیں
جنہیں تین چاہنے والے مانگتے ہیں
دو اور تین پانچ ہوتے ہیں
اور پانچ سے دس ہوتے ہیں
اور دس سے بیس ہوتے ہیں
بیس میں سے پانچ کم کرو تو پندرہ
پندرہ میں سے پانچ کم کرو تو دس
دس میں سے پانچ کم کرو تو پانچ
اور پانچ سے دس ہوتے ہیں
اور دس سے بیس ہوتے ہیں

"ہاہاہا" گیت ختم کرتے ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ "دیکھا کتنا اچھا گیت تھا ٹونو۔ ایک تو پیا نکالو"

کچھ عجیب سا گیت تھا۔ بالکل معمولی۔ لفظوں کی تکرار تھی اور ہندسوں کی گنتی۔ لیکن سگرٹوں کی تلخ سی بو اور ان کا تیز سا ذائقہ اس میں بھرا ہوا تھا اس گیت میں عجیب دھواں سا تھا جو اندر جا کے چبھتا تھا اور کچھ ایسی لہریں چھیڑتا تھا جو دل کے ساحل سے چھو کے کہتی تھیں۔ تم ہمیں جانتے ہو

تم ہمیں جانتے ہو۔ یہ دُھن، یہ گیت، یہ تمکرار تمہاری ہے۔
میں نے اُسے دس روپے کا نوٹ دیا "کارمن عجیب سی دُھن ہے اجنبی
بھی، اور پہچانی ہوئی بھی۔ مُوری نغمہ ہے۔ ایشیائی، افریقی اور یورپین
سنگیت کا انوکھا امتزاج جو بیک وقت کئی لہریں پیدا کرتا ہے۔ تمہارے
حسن کی طرح، جو ایشیائی ہے، جو یورپین ہے، جو افریقی ہے۔
تین برِاعظموں نے مل کے اس کا خمیر اٹھایا ہے۔ تو میرے لئے اجنبی ہے
اور نہیں بھی۔ تجھے جانتا ہوں اور نہیں بھی"
"پوری طرح سے جان لو" اُس نے ہنس کر کہا "سو روپے کا ہرا نوٹ چاہیے
سی نور!"
میں نے اُٹھ کر کہا "تو میں جاتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو میں تمہیں سو کا
نوٹ نہیں دے سکتا"
وہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ ایک دم سنجیدہ سی ہو گئی
بولی! "محبت کا کھیل مجھ سے نہ کھیلو۔ میں آبرو باختہ عورت
ہوں، پھر بھی عورت ہوں۔ اس کھیل میں ہمیشہ عورت کی ہار ہوتی ہے
میں کل سے تمہیں فلیٹ میں نہ گھسنے دوں گی"
"اپنے عاشق کو گھسنے نہ دینا۔ ٹو نو تو آ سکے گا"
"تم میری سمجھ سے بالاتر ہو۔ اچھا تو چلو کوئی پکچر ہی دیکھیں"

ڈونو اور کارمن بہت اچھے دوست بن گئے۔ ڈونو کوئی اصلاح پسند نہ تھا کہ آبرو باختہ لونڈیوں کی زندگی سُدھارتا۔ وہ کارمن میں دلچسپی لے رہا تھا اپنے کسی جذبے کی تکمیل کی خاطر۔ یہ جذبۂ محبت نہ تھا اتنا اُسے معلوم تھا۔ جسم کی پکار کبھی نہ تھی یہ بھی اُسے معلوم تھا۔ کارمن بیحد خوبصورت تھی آتش فشاں لاوے کی طرح خوبصورت۔ وہ اس کے آتشیں ہونٹوں کی زبان پڑھ سکتا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں ماپ سکتا تھا۔ اُس کی لچکتی ہوئی کمر کے دائروں میں گھوم سکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اک بے پناہ جھجک اُس کے راستے میں حائل تھی۔ وہ جب تک اس جھجک کو پڑھ نہ لے، اس کا اندازہ نہ کرلے، اسے سمجھ نہ لے وہ کیسے آگے بڑھ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں بڑے اچھے دوست بن گئے۔ وہ بڑا ذہین تھا، اس کی ذہانت اسٹاک ایکسچینج پر آزمائی جاتی تھی اور ہزاروں کے وارے نیارے ہوجاتے۔ اس کا ذہن ایک تیز چھری کی طرح تھا۔ بڑے بڑے بروکر اس سے ڈرتے تھے اسٹاک ایکسچینج پر اُس کے کھیل لوگوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ لوگ ہارتے، لوگ جیت جاتے۔ مگر وہ ہمیشہ ہمیشہ جیت جاتا۔ وہ اسٹاک ایکسچینج کی ہر گتھی سُلجھا سکتا تھا، صرف کارمن کے نشہ کی گونج کا تجزیہ اُس سے نہ ہوسکتا تھا۔

وہ دونوں بڑے اچھے دوست بن گئے۔ ڈونو نے کارمن کو

سدھارے نے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی۔ کارمن باب الہند میں ناچتی تھی، گاتی تھی، روپے ہُن کی طرح برستے۔ شام کو کسی کے ساتھ سیر کے لئے چلی جاتی، پھر رات باہر رہتی یا فلیٹ میں شراب پی کے سو رہتی۔ ٹونو اُسے سہ پہر کے قریب سوتے سے جگاتا۔

"اٹھو۔ اٹھو"

"سونے دو مجھے"

"اٹھو اٹھو۔ تمہاری دوکان کھلنے کا وقت ہو گیا"

"ٹونو چائے بناؤ میرے لئے"

"ٹونو میں آج ہرا گاؤن پہنوں گی۔"

"ٹونو میں آج ساری کیوں نہ پہنوں؟"

مگر منہ ہاتھ دھو کے وہ ہمیشہ جیڈ کے رنگ کا گاؤن پہنتی جو اُس نے ٹونو سے پہلی ملاقات کے روز پہنا تھا۔ وہ گاؤں، وہی منٹیلا نوہی دوپٹہ۔ پھر وہ دونوں چائے پیتے۔ پھر وہ اسے اپنی البم دکھاتی۔ اپنی ماں کی تصویر، اپنے باپ کی تصویر۔ یہ میرا بڑا بھائی ہے۔ یہ مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ یہ خالہ ہے۔ یہ — یہ میرا منگیتر — تھا۔ بیلوں سے لڑنے والا' خونخوار بیلوں سے لڑنے والا۔ ڈان گریز یا نو"

گریزیانو تنگ پتلون اور ٹپکا باندھے کھڑا تھا۔ اُس کا سینہ کشادہ تھا، لب پتلے، آنکھیں گہری اور جذباتی، اور وہ پوری باہوں والی قمیص پہنے اک عجیب رعنائی سے کھڑا تھا۔ دائیں طرف فوٹو گرافر نے زیتون کی

ایک شاخ سے تناسب قائم کیا تھا۔

پہلی بار جب میں نے یہ فوٹو دیکھا تو پوچھا "کارمن، پھر کیا ہوا؟"
اُس نے زور سے البم بند کر دیا، اور میری طرف دیکھ کے بولی "تمہیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے گٹ آؤٹ"

میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں کہتی ہوں گٹ آؤٹ، گٹ آؤٹ"

میری حیرت بڑھتی گئی۔ مگر اُس نے مجھے کمرے سے باہر نکال کے ہی دم لیا۔ اس روز کے بعد میں نے کبھی اُس سے کچھ نہیں کہا۔ مگر ہم دونوں ہر روز یہ البم دیکھتے، خوشی خوشی چائے پیتے۔ اس کے بعد وہ باب الہند چلی جاتی، میں اپنے دوستوں میں آجاتا۔ ہفتے میں دو روز میں اور کارمن باہر جاتے، بلا ناغہ۔ یہ دو روز اس کے ٹونو کے ہوتے تھے۔ اُس روز اُس کی دوکان بند ہوتی تھی۔ اُسکے رُخساروں پر غازہ نہ ہوتا تھا، اس کے ہونٹوں پر سُرخی نہ ہوتی تھی، اس کی آنکھوں میں مسکارا نہ پڑتا۔ اُس روز ایک سپینی دیہاتی لڑکی کیطرح وہ میرے ساتھ چلتی۔ ہنستی، کھیلتی، ناچتی، گاتی، ننگے پاؤں دوڑتی، جھاڑیوں سے تیتریاں پکڑتی۔ راہ چلتے ہوئے بچوں سے پیار کرتی۔ ہم لوگ بالعموم شہر سے بہت دُور باہر نکل جاتے، کبھی کلیان کے پاس، کبھی ا ا انہ، کبھی گھوڑ بندر سے آگے۔ میرے پاس سپینی گیتوں کا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں اپنے دوستوں میں بہت بدنام ہو گیا تھا۔ مگر

جھجھک بدستور قائم تھی۔

ایک اتوار کو میں نے اُس سے کہا "کارمن میں اگلے بدھ کو نہ آسکوں گا۔"
"کیوں؟"
"میری بہن کی شادی ہے اُس روز"
"تمہاری بہن کی شادی ہے اور تم مجھے نہیں لے چلو گے؟"
میں سٹپٹا گیا، کچھ نہ کہہ سکا۔
اُس نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور درشتی سے کہنے لگی "ٹونو، میں ضرور چلوں گی۔ کارمن تمہاری بہن کی شادی میں ضرور چلے گی۔ تم مجھے لے جاؤ نہ لیجاؤ، میں خود وہاں پہونچ جاؤں گی"
"اچھا تو میں تمہیں خود آکے لیجاؤں گا"
"اور تمہیں ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔
"کہاں؟"
"بازار میں۔ مجھے کچھ خریدنا ہے"

وہ سب کچھ اُٹھا لائی۔ جتنے روپے اُس کے پاس تھے بہت روپیہ تھا اُس کے پاس۔ بہت کچھ خریدا اُس نے، زیور، کپڑے، برتن۔ جہاں میں نے کچھ کہا اور اس نے ڈانٹ پلائی "تمہیں

اس سے کیا۔ یہ میرے روپے ہیں۔ میں چاہے انہیں پھونک دوں، چاہے جلا دوں"

میں نے کہا عقل سے کام لو۔ جذباتی نہ بنو۔ تم ہی نے تو کہا تھا عورت محبت کے معاملے میں ہمیشہ ہار جاتی ہے"

"کون سور تم سے محبت کر رہا ہے"

شادی کی رات وہ سہیلیوں میں ایسے گھل مِل گئی کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ وہ اجنبی لڑکی، وہ بازار کی طوائف، شرافت کا جھوٹا لباس پہنے بیاہ کی رسموں میں شریک ہو رہی تھی، وہ بیاہ کے گیتوں میں شریک ہو رہی تھی، خود ڈھولک بجانا سیکھ رہی تھی، عجیب عجیب سے سوانگ بھر کے تماشائی عورتوں کا جی بہلا رہی تھی، ناچ رہی تھی، گا رہی تھی، دلہن کے مہندی لگا رہی تھی۔

پھر بارات آ گئی۔ دولہا کو اندر لایا گیا۔ سہیلیوں نے گیت گائے۔ دولہا کے سر پر سے روپے وارے گئے۔ کارمن نے کانپتے ہاتھوں سے روپے گھما کے پھینکے اور پھر دولہا کو ہاتھ سے پکڑ کے ڈیوڑھی کے اندر لائی۔

پھر وہ بھاگی بھاگی دلہن کے پاس پہنچی، اور دیر تک گھونگھٹ اُٹھائے اُس کی صورت دیکھتی رہی۔ پھر اس کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ

کانپنے لگی اور کانپتے کانپتے گر پڑی۔ دیر تک بیہوش پڑی رہی۔
جب ہوش میں آئی تو مجھ سے کہنے لگی "ٹونو مجھے گاڑی منگا دو"
میں جاؤں گی۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میرا دل اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔
وہ چلی گئی۔

ایک بجے کے قریب بیاہ کی رسم ادا ہوگئی اور بدھائی کے
ترانوں نے، اور عورتوں کے گیتوں نے، اور بینڈ کے نغموں نے، اور
بچوں کے شور و غل نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور ان تمام آوازوں
تصویروں جذبوں کے اوپر اوپر کارمن کا چہرہ گھومنے لگا۔ خاموش
چہرہ، بے زبان چہرہ، لُٹتا ہوا چہرہ خاموشی سے میری طرف تکتا گیا۔
دیر تک فضا میں تیرتا رہا، حتیٰ کہ میں نے بھی گاڑی لی اور اس میں بیٹھ
کر اُس کے ہاں جا پہنچا۔
وہ شراب پی رہی تھی۔
اُس نے مجھے بوتل دکھا کے کہا "اصلی بوردے ہے۔ پیو گے؟"
میں نے اس سے گلاس چھینتے ہوئے کہا "سو جاؤ"
وہ چیخ کر بولی "میرا گلاس واپس کر دو۔ تم نے میرا سب کچھ مجھ سے
چھین لیا۔ اب میرا گلاس بھی مجھ سے چھینتے ہو۔ کمینے"
میں نے کہا "میں نے کیا چھینا ہے تم سے۔ تم ان کپڑوں اور زیوروں
کا تو ذکر نہیں کر رہی ہو"

"نہیں، میں تمہارا ذکر کر رہی ہوں۔ تم ــــ تم جنرل فرانکو ہو"

"کیا بک رہی ہو"

"میں بک رہی ہوں۔ ــــ سنو۔ میں بک رہی ہوں، واہ رے میرے جنرل فرانکو"

"میں تو نو ہوں کارمن۔ لو اب سو جاؤ"

"نہیں، تم مجھے شادی پر کیوں لے گئے۔ میں نے کہا تھا، پھر بھی تم مجھے کیوں لے گئے۔

کرائیسٹ۔ میں اچھا تھا مر جاتی"

"کارمن! کارمن!"

"کون کارمن کو بلا رہا ہے۔ وہ کارمن جو اپنے ماں باپ کی بیٹی تھی، اپنے بھائیوں کی بہن تھی، اپنے منگیتر کی ہونے والی بیوی تھی اسے جنرل فرانکو نے پھانسی پر چڑھا دیا۔ زندہ باد فرانکو"

کارمن کی سیاہ پتلیوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ اس نے اپنی انگلیوں میں میرے ہاتھ کی انگلیاں لیلیں۔ شکنجے کی طرح کس لیں بولی "میں تم سے پوچھتی ہوں تم اس طرح سے کیوں ہمیں مارتے ہو۔ پہلے تم نے میرے ماں باپ کو مارا کیونکہ وہ اشتراکی تھے۔ پھر میرے دونوں بھائی میدانِ جنگ میں مارے گئے؟ ایک میڈرڈ میں، ایک بارسلونا میں، میں اور میرا منگیتر ایلی کانتے سے بھاگ کھڑے ہوئے ہم دونوں میڈرڈ کے محاذ پر لڑتے رہے۔

"وہ ہمیں کبھی شکست نہ دے سکے۔ بھولتے ہو تم۔ میڈرڈ کبھی فتح نہیں ہوا۔ وہ یہاں زندہ ہے، میری چھاتیوں کی ہر بوند میں"

اُس نے گلاس ختم کر دیا۔ میں نے بوتل پرسے سرکا دی "سو جاؤ کارمن"

"کون سوئیگا آج۔ وہ خندق دیکھ رہے ہو۔ دائیں طرف سائن ہیریلا کا گرجا ہے، بائیں طرف تانبے کے مِل کی ٹوٹی ہوئی دیوار۔ سامنے دشمنوں کی خندق۔ بیچ میں انجیر کا پیڑ، جہاں میرا منگیتر مرا تھا۔

"تمہارا منگیتر؟"

"اتنی جلدی بھول گئے۔ ڈان گریزیا تو اتنی جلدی بھلا دینے والا جوان نہ تھا۔ وہ خوبصورت تھا، وہ دل کا خوبصورت تھا۔ اس کی رائفل خوبصورت تھی۔ ہم سات دن لڑتے رہے۔ کھانے کے لئے صرف تین بسکٹ ملتے تھے۔ ڈان گریزیا تو جو خونخوار بیلوں سے لڑتا تھا۔ آج بھی خونخوار بیلوں سے لڑ رہا تھا ۔۔۔ ادھر لاؤ بوتل"

میں نے بوتل اُس کے سامنے رکھدی۔

"یہ بوروے کی خالص شراب ہے۔ کس قدر اچھا ذائقہ ہے اس کا۔ پیاس بجھا دیتی ہے۔ مگر اُس وقت ہمارے پاس شراب کیا پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ پانی مِل کے اندر تھا، اور ڈان گریزیا تو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتا تھا جب تک کوئی اُس کی جگہ نہ آجائے۔ تب میں خود پانی لانے کے لئے اُٹھی۔

"نلکے سے پانی بھر کے لوٹ رہی تھی کہ دشمن نے، جو بِل کے اندر چھپے ہوئے تھے، گولی چلائی۔ یہاں بازو میں زخمی ہوئی۔ یہ نشان دیکھ سکتے ہو، پڑھ سکتے ہو یہ نشان کیا کہتا ہے؟"

میں چپ تھا۔

"میں پانی لے آئی، لیکن جلدی میں غلط رستے سے بھاگی۔ اور جب مل سے باہر نکلی تو دونوں خندقوں کے درمیان تھی، اور سامنے انجیر کا درخت تھا۔ گریزیا نو نے کہا لیٹ جاؤ۔ میں گھٹنے لگی۔ مگر پانی برتن میں موجود تھا۔ دشمن گولیاں برسا رہا تھا؛ میں گھسٹ رہی تھی اور خون میرے بازو سے بہہ رہا تھا۔ پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ ڈان گریزیا نو چیتے کی طرح جست کر کے آگے بڑھا۔ سن سن کرتی ہوئی گولیاں گذر گئیں۔ اُس نے مجھے اُٹھا لیا، اور واپس اپنی خندق کو چلا جیسے فاتح خونخوار بیل کو زخمی کر کے امفی تھیئٹر سے باہر آ رہا ہو۔

"میں اس کی آغوش میں تھی۔ گولیوں کا نغمہ چاروں طرف تھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں گھس گئی تھی۔ وہ مجھے شادی کی انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ سنو سنو کارمن۔ میں مر رہا ہوں۔ آخری بار سن لو کارمن، میں مر رہا ہوں مگر تم میری بیوی ہو۔

"اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ثبت ہو گئے۔ میں نے اُس کے گلے میں بازو ڈال کے کہا میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔

"وہ ہنسا۔ "مجھے ایک سگرٹ دو"۔ اور آہستہ آہستہ سگرٹ پیتے ہوئے

گانے لگا

میرے چھوٹے سے سگرٹ کیس
آج تم بالکل خالی ہو
کل اتوار ہے لیکن
کل تمہیں بھر دوں گا (سگرٹوں سے)
آج میرے پاس صرف دو سگرٹ ہیں
جنہیں تین سپاہی پینا چاہتے ہیں
دو اور تین پانچ ہوتے ہیں

" کارمن ! کارمن !"

وہ اونچے اونچے سروں میں گا رہی تھی۔ یکایک خاموش ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی " وہ گیت گاتے گاتے مر گیا۔

" اور عین اسی وقت سان میریا کی گرجا کے گھنٹے جھنجھنا اٹھے۔

" جس طرح آج دولہا کی آرتی کے وقت گھنٹے جھنجھنائے تھے۔

دو کرائسٹ !"

وہ تکیئے میں سر چھپا کر رونے لگی۔ پھر یکایک اس نے سر اٹھایا ' اور میری طرف آتش بار نگاہوں سے دیکھکر بولی " کیوں مارتے ہیں وہ کیوں مارتے ہیں وہ ' اس طرح۔ بچوں کو مار دیتے ہیں ' لڑکوں کو گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ ماں باپ کو پھانسی چڑھا دیتے ہیں۔ بہنوں کی عزت لوٹ لیتے ہیں۔ اوہ ــــ اوہ ــــ "

وہ زور زور سے رونے لگی

"یہ جنگ، مجھے اس سے نفرت ہے۔ کب ختم ہو گی یہ جنگ"

"ہو جائے گی!"

"ہاں ہو جائے گی، ٹونو" وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ اک عجب انداز سے خوش ہو کر بولی "ہاں ضرور ہو جائے گی، ٹونو، ہو جائے گی، جیسے آج تمہاری بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ میں آج بہت خوش ہوں، ٹونو۔ آج مجھے اپنا انجیر کا درخت مل گیا ہے۔ ایلی کانتنے کے بازار کا فرش جیڈ کی طرح چمک رہا ہے۔ ہم گدھوں پر سوار ہو کے گرونو کے سپا کو جا رہے ہیں۔ راستے میں انجیروں کے درخت لدے پڑے ہیں، اور گلاب کے پھولوں سے فضا مہک گئی ہے۔ آج میری شادی ہوئی ہے ٹونو، سنتے ہو، آج میری شادی ہوئی ہے۔ ڈان گریزیانو میری آغوش میں ہے۔ اسکی شادی کی انگوٹھی میری انگلی پر ہے اور سان میریا کا گرجا گھنٹے بجا رہا ہے سنتے ہو ٹونو۔ یہ سان میریا کی گھنٹیوں کی آواز ہے، یہ سان میریا کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔۔۔۔۔۔"

کارمن سو گئی۔

اگلے روز میں اُس کے فلیٹ پر گیا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔
باب الہند پہنچا تو وہ اُسی طرح ناچ رہی تھی، اور رچھا رہی تھی، اور اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی، اور سیاہ گھنگھریالے بال یوں جھٹک جاتے جیسے کائنات پر گھنیری بدلیاں چھا رہی ہوں اور سپینی گیت میں مُور رہی نغمے کا وحشی لہراؤ کانپ کانپ جاتا تھا۔
ایک پی شاسی نور۔
اور چاروں طرف سے سکّوں کی بارش ہوگئی۔ ایک سکّہ میں نے بھی دیا۔ اس کی پتلی پتلی گرم اُنگلیاں آگے بڑھیں، پھر رک گئیں۔ وہ ایک اجنبی انداز سے آگے بڑھ گئی، جیسے اُس نے مجھے کبھی دیکھا نہ تھا، نہ کبھی پہچانا تھا۔ دل کو قرار آیا۔ ایک سکّہ میں نے دیا وہ سکّہ اس نے نہیں لیا۔ بات ختم ہوگئی۔ مجھے احساس ہوا جیسے بات ختم ہوگئی ہمیشہ کے لئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا آگے بڑھ گیا۔ باب الہند سے بہت دُور آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور تک میں نے باب الہند اور کارمن اور اس جم غفیر کو جو اُس کے گرد تھا اپنے ساتھ ساتھ ساحل کی ریت پر چلایا۔ پھر باب الہند اور وہ ہجوم غائب ہوگیا اور صرف کارمن رہ گئی جو دُور تک میرے ساتھ سمندر کی لہروں پر چلتی گئی۔ پھر وہ بھی اوپر اُٹھ کر

شفق کے بادلوں پر اُڑنے لگی، اور پھر تاروں میں جا کے غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا، اور لہریں عجیب سے راگ گانے لگیں، اور تارے پلکیں جھپک کے مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

اور دور کہیں بہت دُور سان میریا کی گرجا کے گھنٹے بجنے لگے

گھاٹی

وہ اُچک کر کھیت کی مینڈھ پر آ رہا۔ اور دھوپ تیز ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ کے منظر کو دیکھنے لگا۔ کھیت میں دور تک کپاس کے پھول کِھلے ہوئے تھے۔ یہ کھیت مینڈھ سے نشیب کی طرف جاتے تھے۔ اور پھر گھاٹی تک یونہی نشیب میں چلے گئے تھے۔ اور پھر گھاٹی کے اوپر بھی حدِ نگاہ تک یہی کپاس کے پھول کِھلے ہوئے تھے۔ بیچ میں کپاس کے سپید پھول اور کھیتوں کے چوکور کناروں پر سن کے سنہرے پیلے پیلے پھول۔ کہیں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور کھیت جو نشیب سے فراز کی طرف جاتے تھے کف آلود سمندر بن گئے لہریں، جھاگ ہی جھاگ، ٹیڑھی ٹیڑھی اچھال جو بَل کھاتی ہوئی گھاٹی کے اوپر ہی اوپر اٹھتی گئی۔ اور سن کے سنہرے پھول شانوں

پر ڈولتے گئے۔ اور گھاٹی کے اوپر ایک چرواہا نظر آیا جو گایوں کو سونٹی سے ہانکتا ہوا گاؤں لیجا رہا تھا۔ گاؤں جو گھاٹی کے بالکل دوسری طرف، چوٹی سے ذرا ادھر ایک شاداب تلہٹی میں واقع تھا۔

راج سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور زور سے چلّایا۔ "او جوان۔ جواان او ووئے!"

دُور اوپر چرواہے نے گھوم کر دیکھا۔ راج سنگھ کی آواز ابھی تک بلند گھاٹی کی سلوٹوں اور چٹانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر راج سنگھ کی طرح اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور چلّا کے کہا۔

"ہلا او و وے!"

گائیں چرتے چرتے رک گئیں اور گردن موڑ کر نیچے دیکھنے لگیں۔ دور نیچے جہاں راج سنگھ کھڑا تھا۔

راج سنگھ پھر چلّایا۔ "او جوان۔ میرے گھر کہہ دینا۔ راج سنگھ جمعدار آگیا ہے"

"او وئے سلام ٹھاکر چاچا راضی باضی تگڑا خوش ایں ایں ایں!"

چرواہا وہیں دو میل دور سے چلّایا۔ اُس کی خوش آیند آواز اور اُس کے مسرور لہجے نے ساری وادی کو اپنے مسرت بھرے نغمے سے معمور کر دیا۔

"لیعقوب کدھر اے اے ؟" چرواہے نے فوراً بعد ہی پوچھا۔
"اوہ میں بڑا تگڑا راجی باجی آن۔ لیعقوب لالہ دی بڑا خوش لے ۔
پنڈی ملیا سی۔ جلدی آوے گا۔ جوان اووئے۔ گھر میرے خبر کر دے اووئے"
چیختے چیختے راج سنگھ کا دم پھول گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔
چہرے کی رگیں تن گئیں۔ ایک عرصہ سے وہ ٹیلیفون پر بات کرنے
کا عادی ہو چکا تھا اور گاؤں کے اس ٹیلیفون کو بالکل ہی بھول
گیا تھا۔ جو بغیر کسی تار کے یا بجلی کی بیٹری کے پانچ چھ میل کے حلقے
میں کام کر سکتا ہے۔ یہاں بول چال کی زبان کا انداز نہیں چلتا۔ اسکی
گرامر الگ ہے۔ جملے الگ نہیں بولے جاتے۔ مشین گن کی گولیوں
کی طرح ایک ساتھ تڑاتڑ مگر گھوم گھوم کر نکلتے ہیں۔ کیونکہ مقصد اُن
کا وادی میں گونج پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جب تک الفاظ سے گونج پیدا
نہو گاؤں کا یہ ٹیلیفون کام نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے استعمال
میں پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف ہوتی ہے۔ اور گلے کا تانپورہ ہمیشہ
کسا رہتا ہے۔ راج سنگھ نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا۔
اور مسکرانے لگا۔ پہلے تو وہ کتنی دیر تک اس طرح گھاٹی کی چوٹی
پر یا گھاٹی کے نیچے کھڑے کھڑے باتیں کر سکتا تھا۔ بچپن میں جب
بڑے کٹھا کر ہل چلانے کے لئے نیچے کھیتوں میں جاتے تو وہ دوپہر کے
وقت چلّا کے کہتا
"روٹی۔ رو رو روٹی اچھنی اووئے" (روٹی آئی ہے)

اور اس کا باپ وہیں کھیتوں میں سے چلا کے کہتا۔ "بہیل کرلائے نڑھیا آآہہ!" (جلدی سے لا بیٹیا)

اور پھر اُسے یاد آیا کہ جب جنگ سے پہلے کہوٹہ کی موٹر روڈ تیار ہو رہی تھی۔ اور اُس نے کھیت کی مینڈھ پر کھڑے کھڑے گردن موڑ کے اپنے عقب میں نیچے بہتے ہوئے نالے کی طرف دیکھا۔ جس کے کنارے کنارے وہ موٹر روڈ گزر رہی تھی۔ تو اس کی یاد کے جھلملاتے سنہری سایوں میں وہ لمحے زندہ ہو گئے۔ جب یہاں اس ندی کے کنارے خیمے لگے تھے۔ اور مزدور پتھر کوٹ کوٹ کر روڑی تیار کر رہے تھے۔ اور خوب چند براہمن جو برہم پور کا رہنے والا تھا۔ اس موٹر روڈ کا ٹھیکہ لیکے راولپنڈی سے آیا تھا۔ وہ بھی ایک بڑے خیمے میں رہتا تھا۔ اور اسکے بیوی بچے بھی وہیں آ گئے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے۔ اُس بیوی برما کی رہنے والی تھی۔ اور پہاڑی زبان نہیں جانتی تھی۔ ہاں اُس کی دونوں بیٹیاں پہاڑی پنجابی میں فر فر بات کرتی تھیں۔ اور پھر کبھی کبھی برمی زبان میں نجانے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتیں۔ انجنا اور سجنا وہ دونوں بہنیں کس قدر شریر، شوخ اور آزاد تھیں، برمی عورتوں کی طرح۔ اور راج سنگھ کو یاد آیا وہ لمحہ جب اسی کھیت میں گھس کر اس نے انجنا کو تربیڑی چراتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ نیچے ندی کے کنارے سڑک بن رہی تھی۔ اور لوہے کا دیوہیکل سٹیم رولر جھومتا جھامتا سڑک پر پتھر کے ٹکڑوں کو ہموار کرتا چلتا تھا۔

اور پرے بڑے خیمے کے باہر انجنا کا باپ اک آرام کرسی پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ اور اس کا انگریز منیجر اپنے خیمے سے شب خوابی کے گون میں ملبوس تولیہ سر پر ڈالے نہانے کے لئے جا رہا تھا۔ اور فضا میں گٹاریاں کرائیں کرائیں کرتی ہوئی اپنے بھورے سنہری پر تولتے ہوئے اُڑ گئیں۔ اور راج سنگھ جو بڑے ٹھاکر کے لئے کھانا لے جا رہا تھا۔ کھیتوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوتے دیکھکر رُک گیا۔ اور اپنی جگہ دبک کے بیٹھ گیا۔ گو بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ مگر فضا ابھی تک پالے سے جکڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گھاس پر شبنم ابھی تک سوکھی نہ تھی۔ اور ترٹیڑیوں کی اشتہا انگیز خوشبو نتھنوں میں گھستی چلی آرہی تھی۔

پھر سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ راج سنگھ بھاگتا ہوا بیلوں کی طرف گیا۔ انجنا گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سبز سبز لوی لچکیلی نرم نرم ملائم ترٹیڑیوں کے دو دانے تھے۔ چوری کے احساس سے اس کا چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ اور اس کی چھوٹی سی ناک بڑی عجیب سی نظر آرہی تھی اور اُسکا چھوٹا سا قد اور اس کا گول مٹول سا جسم، راج سنگھ کو اس وقت انجنا بالکل ایک لوی لچکیلی نرم ملائم ترٹیڑی کی طرح معلوم ہوئی۔ اس نے انجنا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کھاؤ۔ سوہنیو۔ خوب کھاؤ۔ اور اُتار دوں؟"

اور انجنا نے ہاتھ جھٹک دیا۔ اور ترٹیڑیاں پھینک دیں۔ اور کھیت کی مینڈھ کی طرف بھاگ گئی۔ اور اتنی اونچائی سے دوسری طرف چھلانگ مار کر

نیچے سڑک پر اُتر گئی۔ اور بھاگتے بھاگتے اپنے خیمے میں چلی گئی اور راج سنگھ
ہنسنے لگا۔ اور برڑے ٹھاکر کا کھانا اٹھائے آگے چلدیا اور جتیا گاتا گاتا دُور
نکل گیا۔ اور انجنا دیر تک اس کے ہاتھ کے مس کو محسوس کرتی رہی، اور
راج کا قرب اور اُس کی طاقت اور اس کی جوانی اور اس کی ہنسی اور
بے باکی اور اک عجیب سی صحت افزا، مردانہ خوشبو اس کے نسائی دل پر
چھا گئی۔ اور اس نے چاہا کہ وہ کل پھر تر بیڑیاں چُرانے جائے۔ اور راج
کے ہاتھوں پکڑی جائے اور خوب پٹے۔ اُس کے باپ نے بھی
اُسے کئی بار پیٹا تھا۔ مگر وہ اور بات تھی شاید۔ ورنہ وہ راج سے پٹنے
کی خواہش کیوں کر رہی تھی۔ اُس رات کو وہ ٹھیک طرح سے نہ سو سکی
تھی۔ اور کچھ عجیب سی خوشبوئیں، پرچھائیاں اور گونجیں اس کی نیند کی
نازک دنیاؤں میں لرزتی رہیں۔ اور ایک میٹھا میٹھا گرم سیال گیت بن کر
اس کی روح میں جذب ہوتی گئیں۔ جب وہ صبح اٹھی تو اس کا سارا جسم
پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور جب کل کی طرح اُسی وقت کھیتوں میں
دانستہ چوری کرنے کی نیت سے اور نادانستہ راج سے ملنے کے لئے
گئی تو اُسے مایوسی نہیں ہوئی۔

راج نے پوچھا۔ "سنجنا تمہاری بڑی بہن ہے یا چھوٹی؟"

"تمہیں کیا معلوم ہوتا ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم چھوٹی ہو"

"ہاں" انجنا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اور تمہارا بھی کوئی بڑا

بھائی ہے ؟"

" نہیں ۔ ایک چھوٹی بہن ہے ۔ پر وہ بہت چھوٹی ہے ۔ آٹھ برس کی "

" تم کیا کرتے ہو ؟"

" میں ایف ۔ اے میں پڑھتا تھا گارڈن کالج راولپنڈی میں ۔ پھر ہمارے پتاجی مر گئے ۔ گردآور تھے اس علاقے میں ۔ اب ہمارے دادا کھیتی باڑی کرتے ہیں ۔ ہم نے کلرکی کی درخواست دے رکھی ہے "

" تم خود کام کیوں نہیں کرتے ہو؟ "

" دادا نہیں کرنے دیتے ۔ کہتے ہیں تجھے نوکری کراؤں گا ۔ باپ کی طرح ۔ میرے دادا طبیعت کے بڑے سخت ہیں ۔ میں ان کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا "

" کھیتی باڑی بھی نہیں ؟"

" نہیں "

" تو ہمارے ہاں نوکری کر لو ۔ منشی کی ایک جگہ خالی ہے "

" دادا کہتے ہیں صرف سرکاری نوکری لے کر دوں گا تمہیں ۔ یہ فصل کٹ جائے گی تو مجھے ڈپٹی کمشنر کے پاس لیجائیں گے "

" ہمارے پتا ڈپٹی کمشنر تو کیا لاٹ صاحب کو بھی جانتے ہیں "

" ہمارے پتا مر گئے ۔ نہیں تو ہم بھی لاٹ صاحب کو یہاں شکار پر بلا رہے تھے "

" شکار پر ؟"

"ہاں۔ میں بندوق بہت اچھی چلا لیتا ہوں۔ اور میرے دادا بھی۔
اور ہمارے پتا کا نشانہ تو کبھی نہ چوکتا تھا"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اب تک کسی نے ہار نہ مانی تھی۔ انجنا کہہ رہی تھی۔ میں عورت ہوں۔
کنواری دھرتی ہوں۔ مجھ میں رس ہے۔ خوشبو ہے۔ سندرتا کی جوت
ہے۔ میرے باپ کے پاس روپیہ ہے۔ موٹر روڈ کا ٹھیکہ ہے۔ انگریز
منیجر ہے۔ میری ماں برما کی آزاد عورت ہے۔ تم کون ہو جنگلی، وحشی،
غریب، بے کار۔ مگر تمہیں اچھا تو لگتا ہوں۔ راج کا دل کہہ رہا تھا۔
مجھ میں بھی رس ہے۔ خوشبو ہے۔ جوانی کا اتھاہ سمندر ہے۔ آؤ تمہیں
اس کی گہرائیوں میں لیجاؤں، تم کنواری دھرتی ہو۔ تو میرا بیج بھی کنوارا
ہے۔ اور جذبے کی روح ایسی اُجلی اُجلی ہے۔ جیسے پچھلے پہر میں کپاس
کے سوئے ہوئے پھول۔ اور پھر راج کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ خاموش لمحہ بار بار
کہہ رہا ہے۔ آؤ۔ انہیں جگا دیں۔ آؤ انہیں جگا دیں۔ اور راج نے آگے
بڑھ کے انجنا کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور اس کے ہونٹ چومنے لگا۔
کیونکہ یہ لمحہ اُن کے انتظار میں تھا۔ جب سے یہ دھرتی بنی ہے۔ یہ آسمان
بنا ہے۔ یہ کائنات پھیلی ہے۔ یہ لمحہ ان کے انتظار میں تھا۔ سانس روکے
ہوئے، محوِ حیرت، پُراسرار خاموشی میں گم۔ ابتدائے آفرینش سے ان
کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ وہ آئیں، ان کے ہونٹ ملیں، اور یہ لمحہ جاگ جائے
یہ دنیا کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ اور یہ آسمان نغموں سے معمور ہو جائے۔

اور یہ خاموش، منتظر، محوِ حیرت لمحہ ایک رنگین بلبلے طرح فضا میں اُڑتا اُڑتا گم ہو جائے۔

راج نے حیرت سے کہا۔ "تمہارے ہونٹ۔ میں نے۔ کیوں چومے"۔ جواب میں انجنا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور کہا۔ "ہائے!" ہائے ایسے کہا اس نے جیسے اس میں سُکھ نہ ہو۔ دکھ ہی دکھ ہو۔ عورت کی ساری زندگی کا دکھ، ماتا کا دُکھ۔ تخلیق کی تڑپ، اپنے آپ کو کھو کر کسی نئی زندگی کو جنم دینے کی اذیت، اس ہائے سے، جیسے کنوار پنے نے اپنے بند بند توڑ ڈالے تھے۔ اور اس کا رُواں رُواں منہ کھولے بارش کی بوند کا منتظر تھا۔ انجنا کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اُس کے ہونٹ کھلے تھے۔ اور ان میں دانتوں کی لڑی نظر آ رہی تھی۔ اور اس کے بال بکھر بکھر کر ماتھے پر آ رہے تھے، اور راج نے پوچھا، "یہ بجلیاں کیوں کڑک رہی ہیں۔ یہ کنوارے بیج کی بوچھار کدھر پڑ رہی ہے۔ وہ زمین کے اندر کیوں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ ایک ہل کی طرح۔ اس کی سانس رُکنے لگی۔ اور اُس نے زور سے انجنا کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

اس وقت زور سے اس کے دادا کی آواز آئی۔ "بڈھیا او وے بھیل کرلا دوئے۔ روٹی راجو آآآ!"

آواز چیختی چنگھتی، گونجتی گونجتی، گرجتی گرجتی، اس کے احساسات کی تہوں کو پھاڑتی چیرتی اندر چلی آئی۔ یکا یک اس نے انجنا کو اپنے آپ سے الگ کر دیا اور کھاتا لیکر بھاگ گیا۔ انجنا دیر تک کھڑی رہی۔

پھر وہیں سبزے پر گر کر ہانپنے لگی۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اُسے چکّر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔ اور گھومتے ہوئے دائروں کے بیچ میں شہنائی کا نغمہ تھا جو بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک تڑ یڑی توڑی اور اسے دانتوں تلے دبا کر کچر کچر کھانے لگی۔ راج نے اُسے مُڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی۔ آگے جا کر وہ پھر مُڑا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی۔ اور جب وہ دادا کو کھانا کھلا کے آیا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی۔

اور پھر راج سنگھ کو وہ خوبصورت تین ماہ یاد آئے۔ جو اب اس کے ادھ کھلے دھندلکے میں پھیل کر ایک ہی لمحہ بن گئے تھے۔ جب وہ اور رانجنا اپنی جوانی کی پہلی محبت کی کہانی لئے کھیتوں میں گھومتے تھے۔ چاندنی میں نہاتے تھے۔ سایوں میں، گھاٹیوں کی اوٹ میں، بارش کی بوچھار میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ جب ہر وقت ایک دوسرے کے قریب رہنا اتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک دوسرے کے سانس اور پسینے سے بھی عطر کی خوشبو آتی ہے۔ جب جذبہ سیراب نہیں ہوتا لیکن سیراب ہونے لگتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فضا میں کلیاں سی کھلنے لگتی ہیں۔ اور پھولوں کے شگوفے پھیلتے پھیلتے ساری کائنات کو گھیر لیتے ہیں، اور ان کے بیچ میں صرف دو دل دھڑکتے رہ جاتے ہیں۔ جب دنیا سمٹتے سمٹتے ایک نگاہ بن جاتی ہے۔ اور پھر وہ نگاہ پھیلتے پھیلتے ساری کائنات بن جاتی ہے۔ اور اس نگاہ کے آگے پیچھے، اوپر نیچے، اِدھر اُدھر کچھ

نہیں ہوتا۔ جذبے کی ہمہ گیری، اس کی آفاقی وسعت اپنے حسن کے بیکراں پھیلاؤ میں ہر شے کو غرق کر دیتی ہے۔

وہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا۔ اب بھی اُس کی یاد آنے سے راج کی سانس رُکنے لگتی۔ جب وہ دُور اوپر گاؤں سے بہت دُور اُدھر ڈاب میں ننگے نہاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے جسم کو حیرت سے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے تھے۔ کتنی پاکیزگی تھی ان جسموں میں حسن مائل پرواز۔ طاقت پر کھولے ہوئے۔ اور پھر، جیسے خوبصورتی اپنی ہی خوبصورتی کے بوجھ سے ایک پھلدار شاخ کی طرح جھک جائے۔ بس اسی طرح انجنا کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔ ان نگاہوں بے حیائی نہ تھی۔ احساس گناہ بھی نہ تھا۔ نمو حسن کی تفسیر بھی نہ تھی۔ ایک گہری پاکیزگی اور عفت اور بھروسہ، جس کا نام ونشان اس نے اُن فلسطینی لڑکیوں میں نہ دیکھا تھا۔ جن کے ساتھ وہ اکثر ساحل کے کنارے نہایا کرتا تھا۔ اور اسے ایران، بغداد، مصر اور فلسطین اور اٹلی میں اپنے معاشقے یاد آئے۔ مگر وہ اس وقت کیوں یاد آئے۔ وہ تو ہوا میں اڑنے والے تنکوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے ان کی غلاظت سے اس کی روح کو کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کی پاکیزگی حاصل کر کے کپاس کے کھیتوں کھڑی تھی۔ اور اس کی نگاہوں میں انجنا ہنس رہی تھی۔

انجنا ہنس رہی تھی اور اشاروں میں اسے بلا رہی تھی۔ گھاٹی کے اوپر

او جوان او وے . . . گھر آجا۔

آواز گونجی۔ لڑکی گھاٹی کے اوپر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔

چن ویرا اوئے اوو وئے، میں آ آ آئی

لڑکی گھاٹی سے نیچے اترنے لگی۔ اور دوڑتے دوڑتے نیچے آرہی تھی۔ بھاگتی بھاگتی گھاٹی اتر کر نشیب میں آگئی۔ اور کھیتوں کو پھلانگتی پھلانگتی۔ بالکل اس کے قریب آکر اس کی چھاتی سے لپٹ گئی۔

"میرے ویرا چن!" (میرے چاند جیسے بھائی)

اور راج سنگھ نے اپنی چھوٹی بہن کو زور سے اپنے گلے سے لپٹا لیا۔ اور اس کی پیشانی کو چومنے لگا۔ گھر کی چہار دیواری اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ اور اس نے غمناک آواز میں کہا۔ "میری ننھی بہن، شریر کملو۔ تو تو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے تو تجھے پہچانا بھی نہیں!"

"بھیل کرا وئے نڈھیا! گھر آجا!"

دادا بلا رہے تھے۔ اور ہالی اور سارا گاؤں اوپر گھاٹی پر جمع تھا اور آسمان ان کے پیچھے تھا۔ اور بادل ان کے سروں پر اڑ رہے تھے۔ اور سورج کی گرم گرم پیاری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور دھرتی چاروں طرف سے اسے بلا رہی تھی۔ گھر آجا بیٹا۔ گھر آجا۔

راج سنگھ نے کملو کا ہاتھ پکڑا۔ اور وہ دونوں کھیتوں میں دوڑتے گئے۔ اور گھاٹی کے اوپر چڑھنے لگے۔ اور جب وہ گھاٹی کے اوپر چڑھ گئے

تو گاؤں والوں نے راج سنگھ کو گلے سے لگا لیا۔ اور ڈھول بجنے لگے۔
اور کسان ناچنے لگے۔ اور اتنی دُور گھاٹی کے اوپر وہ لوگ کھلونوں کی
طرح نازک اور تُنبک معلوم ہو رہے تھے۔ اور اوپر سورج مُسکرا رہا تھا۔
اور نیچے زمین اپنے بیٹوں کو خوش دیکھکر پھولی نہ سماتی تھی اور ٹیڑھے
میڑھے کھیتوں میں کپاس کے پھول سمندر بن گئے تھے۔ اور اُن کے
ساحل کے کنارے سَن کے سنہری پھولوں کی گوٹ تھی۔

اور دور سہاسے کے اسٹیشن پر کوئی ریل گاڑی کوکتی ہوئی
آکے رُکی، اور اس کی سیٹی کی مدھم آواز غنودگی لئے ہوئے اس گھاٹی
کی فضا میں ایک اجنبی نغمے کی طرح بکھر بکھر گئی۔

۹۷

بھیروں کا مندر لمیٹڈ

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں خدا اور مذہب پر اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ اور پانچ سال سے بیکار تھا۔ ان پانچ سالوں میں میں نے سب پاپڑ بیل لئے۔ پی سی ایس کا امتحان دیا، فیل۔ تحصیلداری کے مقابلے میں بیٹھا، فیل۔ نائب تحصیلداری کے لئے کوشش کی، فیل۔ گرداوری کے لئے درخواست دی، فیل۔ پٹواری بننا چاہا، فیل۔ سب طرف سے مایوس ہو کے میں نے دلّی میں اپنے بڑے بھائی کی فرم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ فرم ان کی اپنی تو نہ تھی مگر چونکہ وہ یہاں خزانچی تھے اس لئے ہم سب لوگ اس فرم کو "بڑے بھائی صاحب کی فرم" کہتے تھے۔ نام تھا مے اینڈ مے۔ بھائی صاحب نے میرے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا........ فیل۔

پھر دوسری فرموں میں کوشش کی، جانسن اینڈ تھامسن اینڈ کو، ٹرلدو رام پچلدو رام گھلدو رام اینڈ کو، رائے صاحب رام جوایا رام بھایا رام سہایا اینڈ برادرز...... فیل!

میرے بڑے بھائی دلّی میں بیس ہزاری میں رہتے تھے، بھیروں کے مندر کے نیچے۔ بھیروں کا مندر اک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا اور نشیب میں دلّی کے ایک سیٹھ نے تین تین کمروں کے پندرہ بیس کوارٹر تعمیر کر رکھے تھے جہاں کلرک صفت مخلوق اپنے بیوی بچوں مرغیوں بلیوں کتوں سمیت رہتی تھی۔ کوارٹروں کے بالکل سامنے پہاڑی ٹیلے پر بھیروں کا مندر تھا۔ دائیں طرف ایک گرجا، بائیں طرف ایک موٹر گراج، اور اس کے قریب ڈاکٹر سب سکھ سہائے کی کوٹھی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کی ان ڈاکٹر صاحب سے گہری چھنتی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے شفاخانے میں کمپونڈری کا کام سیکھنے پر رکھ لیا۔ مگر یہ دھندا بھی مجھ سے زیادہ دیر نہ چل سکا۔ کیونکہ ان دواؤں کے نام اتنے ٹیڑھے ہوتے ہیں کہ آدمی کی سمجھ میں مشکل سے آتے ہیں۔ اور پھر یہ بتانا کہ کونسی دوا زہر ہے اور کونسی نہیں ہے، اور بھی مشکل ہے۔ بعض دوائیں ایسی ہوتی ہیں کہ بیس بوند کی خوراک تک زہر میں شمار نہیں ہوتیں لیکن اکیسویں بوند پر زہر بن جاتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے ہاتھ کا جھٹکا ہی تو ہے۔ دوا میں بیس کی بجائے اکیس بوندیں پڑ جائیں اور مریض ملک عدم

کو سدھارے! نا بابا، میں ایسی کمپونڈری سے باز آیا۔
جب کہیں کوئی کام نہ ملا اور زندگی کے پانچ سال اسی تلاش معاش میں گذر گئے تو بڑے بھائی صاحب کے مزاج کا پارہ ہیرومیٹر کے آخری ہندسے تک پہنچ گیا۔ ایک روز گرج کر بولے "نوکری ملے تو خاک، بھگوان پر بھروسہ نہ دھرم پر وشواس ایسے بے پیندے کا، ناستک عقل کا لونڈا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جب دیکھو اخبار، رسالے اور سوشلزم کا لٹریچر پڑھتا رہتا ہے۔ ارے تو نوکری کیا کرے گا۔ نوکری کے لئے من مارنا پڑتا ہے۔ دن بھر بھگوان کی ارادھنا کرنی پڑتی ہے۔ مجھے دیکھ دن بھر دفتر میں کام کرتا ہوں۔ صبح و شام سندھیا کرتا ہوں۔ رات کو سوتے وقت پھر مالا جپتا ہوں۔ جبھی تو بھگوان نے گھر میں چار بچے دئے ہیں۔ مے اینڈ مے ایسی بڑی انگریزی کمپنی کا کیشیر بنایا ہے۔ دنیا میں عزت دی ہے، مرتبہ دیا ہے۔ ڈاکٹر سب سکھ سہائے ایسے رئیس بھی مجھے خود نمستے کرتے ہیں۔ محلے بھر میں رعب ہے۔ اور ایک تو ہے"
اور اس کے بعد انہوں نے مجھے اک موٹی سی گالی دی جو آج تک زندگی میں مجھے کسی نے نہ دی تھی۔ میں رونے لگا۔
بھابی نے آکر سر پر ہاتھ پھیرا۔
میں اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

بھابی نے خفا ہوتے ہوئے کہا "ارے ہٹئے، کیوں خفا ہوتے ہو بچارے پر۔ ابھی بچہ ہی تو ہے بھگوان کرے گا تو نوکری بھی مل جائے گی۔ اس میں اس کا کیا دوش ہے؟"

"اس کا دوش نہیں تو اور کس کا ہے! بچہ ہی تو ہے! چھبیس برس اس کی عمر ہوگئی۔ اس کے ساتھی دو دو بیاہ کر چکے۔ سپرنٹنڈنٹ تحصیلدار، ہیڈ کلرک بن گئے اور یہ ابھی بچہ ہی رہا"۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔

بھابی فوراً بیچ میں آگئیں۔ "ہٹئے ہٹئے، کیا کرتے ہو! چھوٹے بھائی پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی۔ تم چلے جاؤ دفتر، میں خود اسے سمجھا لوں گی۔"

بھائی نے مڑتے ہوئے کہا "اس سے کہہ دو گھر میں رہنا ہے تو یہ دہریہ پن چھوڑ دے۔ بھگوان کا نام لیا کرے۔ روز صبح و شام مندر جایا کرے۔ میں کب کہتا ہوں کہ نوکری نہیں ملتی تو یہ اس کا قصور ہے۔ ہاں مگر بھگوان کا نام لینے سے سب کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ آخر میرے بھائی نے ایسا کونسا قصور کیا ہے۔ ہے بھگوان تو ہی دیا کر۔"

اتنا کہتے کہتے میرے بڑے بھائی خود آبدیدہ ہو گئے۔ اور مجھے گلے سے لگا کے بولے "بڈھو (میرا نام بدھا رام ہے۔ مگر وہ مجھے پیار سے پیار سے بدھو کہا کرتے ہیں) مندر جایا کر بیٹا، بھگوان کو ناراض

نہیں کرنا چاہیئے۔ بھگوان مل گئے تو سمجھو ساری دنیا مل گئی! مجھ سے وعدہ کرو بدھو کہ میری بات مانو گے"

میں نے سر جھکا کر کہا "بہت اچھا بھیا"

میں نے مارکس کی کتاب تہہ کر دی اور بھیروں کے مندر کا دروازہ کھٹکھٹانے کا تہیہ کر لیا۔

۲

بھیروں کے مندر کے تین پجاری تھے۔ ایک بڑا بوڑھا، دوسرا ادھیڑ عمر کا، تیسرا جوان۔ سب سے کایاں بڑا بوڑھا تھا، سب سے کمینہ ادھیڑ عمر کا، سب سے ہنس مکھ جوان۔ سب سے عالم بڑا بوڑھا تھا، سب سے جھگڑالو ادھیڑ عمر کا، سب سے ان پڑھ جوان جو گایتری منتر کا جاپ بھی ٹھیک ڈھنگ سے نہ کر سکتا تھا۔ ہاں اس کی ہنسی بڑی دلکش تھی اور اس کا چہرہ بڑا خوبصورت تھا۔ اور اس کا بدن گٹھا ہوا تھا۔ بھنگ پینے سے اس کی آنکھیں ہر وقت لال لال ڈورے سے رہتے، اور جب وہ اپنی چھلکتی ہوئی آنکھوں سے نوجوان لڑکیوں کی طرف دیکھتا تو انجان ہرنیاں اپنی چوکڑیاں بھول جاتیں۔ مگر ادھیڑ عمر کا پجاری اس پر بڑی کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اور بڑا پجاری اسے پیاز، اور دوسری گرم غذائیں کھانے سے منع کیا کرتا تھا۔

بھیروں کا مندر بھیروں جینی کے مٹھ کی ملکیت تھا۔ بوڑھا پجاری اس مٹھ کا گورو تھا۔ اس مٹھ کا ایک مندر لاہور میں بھی تھا اور ایک روڑکی میں اور ایک جودھپور میں۔ لیکن دلّی کا بھیروں مندر سب سے بڑا تھا۔ یہاں چڑھاوا بھی سب سے زیادہ چڑھتا تھا۔ اس کے بعد لاہور کا نمبر آتا تھا، اس کے بعد جودھپور کے مندر کا۔ روڑکی کا مندر بڑی خستہ حالت میں تھا، بلکہ وہاں کے پجاری کی تنخواہ بھی دلّی سے جاتی تھی۔ بوڑھا پجاری ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بینک جاتا اور وہاں سے روپے نکال کے روڑکی کے پجاری کو منی آرڈر کر دیتا

بھیروں کے مندر کا صحن بہت کشادہ، مندر بہت تنگ اور بھنگ گھوٹنے کا کمرہ بہت وسیع تھا۔ اس کمرے کے عقب میں تین دوسرے کمرے تھے، تنگ اور کالے اور چھوٹے چھوٹے دروازوں کو لئے ہوئے، کھڑکیاں اُن میں نہ تھیں۔ ادھر والا کمرہ بوڑھے پجاری کا تھا، اُس سے پرے ادھیڑ عمر کے پجاری کا، اُس کے آگے نوجوان پجاری رہتا تھا۔ اُس سے آگے ٹیلے پر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں پرانے سادھوؤں کی سمادھیاں نظر آجاتیں۔ آخری سمادھی مندر سے ایک فرلانگ دور ہوگی۔ یہاں پر باہر سے آنے والے سادھوؤں کے لئے مہمان خانہ تھا۔ اس میں صرف مٹھ کے سادھو ٹھہر سکتے تھے۔ مندر اور مہمان خانے اور کمروں کے گرد چاروں طرف احاطے کی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔

بھیروں کے مندر میں ہر روز پچاس ساٹھ روپے کا چڑھاوا چڑھتا تھا۔ صبح کے وقت عورتوں کی بھیڑ ہوتی، شام کے وقت مردوں کی جو اپنے کام کاج سے فارغ ہو کے بھگوان کے درشنوں کے لئے آجاتے۔ مگر عورتوں کو تو صبح ہی بھگوان کے درشن کرنے ہوتے۔ اس لئے وہ پو پھٹتے ہی مندر میں آجاتیں۔ اور کئی دفعہ تو ایسا ہوتا کہ وہ نوجوان پجاری کو سوتے سے اٹھاتیں۔ اور پھر گھنٹیوں کا خوش آیند شور پہاڑی ٹیلوں سے ٹکراتا ہوا، گونجتا ہوا بیس ہزاری کی فضا پر چھا جاتا۔ اور نوجوان پجاری ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا اور عورتیں قہقہہ مار کر ہنسنے لگتیں۔ جب کبھی نوجوان پجاری کی ڈیوٹی لگتی کہ وہ صبح مندر میں بھگوان کو جگائے تو اکثر جاتری اُسے سوتا ہوا ہی پاتے تھے۔ نوجوان پجاری کو نیند بہت آتی تھی۔ بوڑھا پجاری اُسے اس بات پر بہت ڈانٹتا تھا، اور ادھیڑ عمر کا پجاری تو فحش بکنے لگتا تھا۔ نوجوان کو سزا دینے کے لئے ہی شاید اس کی ڈیوٹی اکثر صبح ہی کے وقت لگائی جاتی تھی۔ نوجوان پجاری بہت جھلاتا مگر گورو کے مرتبے کا خیال کر کے ہر بار چُپ ہو جاتا۔

نوجوان پجاری بہت جلد میرا دوست بن گیا۔ مندر کی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کے ہم لوگ اس کے کمرے میں چلے جاتے اور دن بھر گلچھرے کرتے رہتے۔ اُسی نے مجھے بتایا کہ اِن دنوں مندر سے بڈھے پجاری کو سال میں لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

اور اب بڈھے پجاری کے قدم سمادھی میں لٹکے ہوئے ہیں، اور
اب اُس کی جانشینی کا جھگڑا چل رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خود گدّی
پر قابض ہو جائے مگر عمر اور مرتبے کے خیال سے ادھیڑ عمر کے پجاری
ہی کو شاید یہ گدّی مل جائے۔ یہ بہت برا ہو گا۔ پہلے پہل بڈھا پجاری
اُسے بہت چاہتا تھا مگر اب ادھیڑ عمر کے پجاری کی طرف مائل ہو گیا
تھا، کیونکہ بڈھے پجاری کا خیال تھا کہ نوجوان پجاری نے پوجا پاٹ
کے ابتدائی اصول بھی نہ سیکھے تھے۔

"پھر اب تم کیا کرو گے؟" میں اس سے پوچھا۔
وہ ایک کونے میں سے پیاز کی دو گٹھیاں اٹھا لایا جو اُس نے چھپا
کے رکھ چھوڑی تھیں۔ اُس نے ایک پیاز میری طرف پھینک کر کہا
"لو کھاؤ"۔ دوسری گٹھی وہ خود کھانے لگا۔ کچر کچر "مزیدار ہے نا؟"
اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے پیاز بہت پسند ہے، اور کبھی کبھی چھپکر
میں گوشت بھی کھا لیتا ہوں۔ پھر وِں جتی کے سادھو کو سب کچھ
کھانا چاہیئے"۔

"وہ کیوں؟" میں نے بڑی مصیبت سے کچی پیاز کھانے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔

"جتی سادھو کے دل میں کوئی لالچ نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ گوشت
کھا لے، شراب پی لے، عورت کے ساتھ سو لے، سب کچھ کر کے
سب لالچ دنیا کے نکال دے۔ جب جا کے بھگوان مل سکتے ہیں"

وہ ہنسا۔

"کیوں ہنستے ہو؟"

"کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

"بھیروں جتی کی قسم کھاؤ"

"بھیروں جتی کی سوگند"

"یہ ادھیڑ عمر کا پجاری باوا لچھمن ناتھ دراصل بڑا بدمعاش ہے۔ دیکھتے نہیں ہو صورت سے خباثت ٹپکتی ہے۔ یہ سادھو معلوم ہوتا ہے یا چنڈال؟"

"چنڈال!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"اور یہ چنڈال اپنے آپ کو سادھو کہتا ہے۔ میں اس کی ساری رگیں جانتا ہوں۔"

"رگیں؟"

"ہاں!" وہ دوسرے کونے سے دیسی شراب کی ایک بوتل اٹھا لایا "لو پیو"

"پہلے تم"

"اُس نے بوتل منہ سے لگا لی۔ صرف دو گھونٹ رہنے دیئے۔ ہنس کر بولا "نہیں تم پی لو۔ جتی کا چرن امرت ہے۔"

"دھن ہو گرو جی" میں نے دونوں کڑوے گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کے کہا "امرت کا مزہ آ گیا گرو۔ ہاں تم باوا لچھمن ناتھ کی

بات کر رہے تھے "

" ایک ہی اول نمبر کا حرامی ہے یہ۔ گوروجی تو خیر اب بہت بوڑھے ہو گئے۔ اُنہیں تو دھنیا لے کے بیٹھ گیا۔ اب مجھے دن رات کہتے ہیں پیاز نہ کھاؤ، آنکھیں نیچی رکھو، دھنیا کھایا کرو دن رات۔ یہ باوا اچھمن ناتھ مجھ پر بڑی کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ میں مندر میں کسی لڑکی کی طرف دیکھ جاؤں۔ اور خود، اور خود...... !"

" ہاں، یہ کیا کرتا ہے ؟"

نوجوان پجاری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ باہر دروازے تک گیا۔ پھر واپس آکر میرے کان میں آہستہ سے کہنے لگا.......

میں نے چلّا کر کہا " نہیں نہیں ! یہ سچ نہیں "

" بھیروں جتی کی سوگند۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کی طرف تو یہ دیکھتا ہی نہیں۔ یہ اپنی عمر کی عورتیں ڈھونڈتا ہے۔ گرہستی کی بوجھل مصیبتوں سے تنگ آئی ہوئی عورتیں ہسٹریا، افلاس اور بچوں کے بے ہنگم شور سے پریشان ہو کے اس کے پاس آتی ہیں اور اس سے کہتی ہیں ہمیں بھگوان سے ملا دو، ہمیں کسی طرح سے بھی بھگوان سے ملا دو۔ وہ دن رات مندر میں آتی جاتی ہیں۔ چڑھاوا چڑھاتی ہیں۔ مندر کی سیڑھیوں پر اپنے بالوں سے جھاڑو دیتی ہیں۔ پجاری کے پاؤں دباتی ہیں۔ گھنٹوں ہاتھ جوڑ کر مندر کے صحن میں کھڑی رہتی ہیں اور باوا اچھمن ناتھ سے

پرارتھنا کرتی ہیں کہ وہ اُنہیں بھگوان سے ملا دے۔ ایک بار بھگوان دکھا دے۔"

"اور پھر!"

"اور پھر وہ اُنھیں بھگوان سے ملا دیتا ہے۔" نوجوان پجاری نے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا" ہی! ہی! ہی!" وہ زور زور سے ہنسنے لگا" ایک دفعہ جس عورت نے بھگوان کو دیکھ لیا وہ پھر گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔ بس مندر کی ہو جاتی ہے۔"

۳

جودھپور کے مندر سے تین بائی جی آئیں۔ مٹھ کی سادھنیاں اور مندر کے مہمان خانے میں ٹھہرا دی گئیں۔ انہوں نے سلک کی گیروے رنگ کی ساڑیاں پہن رکھی تھیں۔ اُن کے بال کھلے تھے اور ماتھے پر چندن کا ٹیکہ تھا۔ ان کا رنگ گورا تھا۔ جسم میں جوانی تھی۔ دل میں بھگوان کا نور تھا۔ بیس ہزاری کی فضا ان کی آمد سے ایسے مہک اٹھی جیسے ہر عورت کے لئے پھر شب عروسی آ گئی ہو۔ جب وہ کھرتالیں لے کے ہرے کرشن گاتیں تو بیس ہزاری کی عورتوں کے من جھومنے لگتے، اور وہ سب ان کی آرتی میں شریک ہو جاتیں۔ آجکل گھروں میں دن رات انہی کا چرچا رہتا

تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں کبھی مندر میں قدم نہ رکھا تھا اب دن میں دو تین بار ضرور مندر چلے آتے۔ ایک من چلے کا جی مندر میں درشنوں سے نہ بھرا تو اس نے اپنے گھر پر کتھا رکھدی۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ باگ تینوں بائی جی کو دیکھنے کے لئے چلے آرہے ہیں عورتیں پرساد بانٹ رہی ہیں۔ بائی جی کے لئے دو شالے منگائے جارہے ہیں۔ ہر کتھا پر سوسوا سو کی رقم جمع ہو جاتی۔ ویسے تو یوں بھی بائی جی کا حکم تھا کہ کتھا سے پہلے مندر میں تین دوشالے اور ساٹھ روپے پہنچا دئے جائیں ورنہ کتھا نہیں ہوگی۔ جب ایک نے کتھا کرائی تو باقی گھروں کے لوگ کہاں چوکنے والے تھے۔ ہر گھر میں عورتوں نے ضد کر کے کتھا رکھدی۔ ساٹھ روپے اور تین دوشالے، اور بھگوان کی کتھا۔ اتنی رقم کیا مہنگی تھی۔ ارے صاحب وہ سبزی منڈی کی عورتوں کی بھجن منڈلی جو اس سے پہلے گھروں میں جا کے کتھا بارتا کرتی تھی وہ بھی پچاس سے کم نہ لیتی تھی۔ اور پھر کیسی کالی کلوٹی کھدری عورتیں تھیں اس بھجن منڈلی میں کہ بھگوان بھی دیکھ پائیں تو شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ اور یہاں ان " بائیوں " کے سنگیت میں کیا مزا تھا، یوں سمجھئے گویا سکاچ وسکی گلے میں انڈیلی جارہی ہے۔ واہ واہ واہ!

ذرا یہ آرتی سنئے۔

ہرے کرشن! ہرے کرشن! ہرے کرشن!

بائیوں کے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں، ناگن سی لٹیں رخساروں سے اُلجھ رہی ہیں، اک لٹ چھوٹی بائی جی کے ہونٹوں تک آگئی ہے، گویا اُن پتلے پتلے ہونٹوں کو ڈسنا چاہتی ہے۔ نازک گلے کے اتار چڑھاؤ سے اپنا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ وہ معصوم چھاتیاں بھگوان کے درشنوں کے لئے بیتاب ہو کر دھڑک رہی ہیں۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیر کانوں کی طرف چلی گئی ہے۔ وہ کانوں کی پتلی پتلی لویں، کوئی کچا ہی کھالے اُنہیں۔ ہرے کرشن ہرے کرشن ہرے کرشن، یہ بُرا خیال دل میں کیوں آیا۔ بھگوان کا تصور کرو۔ وہ دیکھو گوپیاں کدم کے سائے تلے گا رہی ہیں اور بھگوان کرشن بنسی ہاتھ میں لئے ناچ رہے ہیں۔ بڑی بائی جی کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ ہوگی، مگر کس قیامت کی متانت ہے۔ ان آنکھوں نے کونسا رنگ نہیں دیکھا۔ یہ سڈول ہاتھ جہاں کلائیوں پر گڑھے پڑتے ہیں۔ مکھن اور بالائی سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ حنا سے رنگین پاؤں کبھی کسی کانٹے کی چبھن سے آشنا نہیں ہوئے۔ بڑی بائی جی کی متانت اور بلوغت ایک پکے ہوئے سیب کی طرح رنگین ہے جو ابھی شاخ سے گرا چاہتا ہو۔ بدھوا آگے بڑھ کے اپنی جھولی بڑھا دے۔

ہرے کرشن! ہرے کرشن! ہرے کرشن!

نہیں تو ان منجھلی بائی جی کے جمالِ جہانسوز کا نظارہ کر جو ان دونوں بائیوں میں اک نگینے سی طرح چمک رہی ہیں۔ ایسے کالے زہریلے

گھنگھریالے بال تو نے کہاں دیکھے ہیں۔ ایسی پھبن تو نے کہاں دیکھی ہے، جیسے بچہ سوتے میں مسکرا اٹھے، جیسے صبح کے دھندلکے میں شبنمی پھول کسی سندر سپنے کو دیکھے اور آنکھیں کھول کے کھل جائے۔ اس ادھ کچی ادھ پکی کلی کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ کھڑتالوں کی لے خوبصورت اعضا کے ہر نازک کھچاؤ کی غمازی کر رہی ہے۔ اور سینے پر گیروے سمندر کی لہریں بکھر جاتی ہیں، لوٹ کر کھو جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، ٹوٹ کر گم ہو جاتی ہیں۔ یہ حسین وادیاں، یہ ٹیلے، یہ دودھ کے جھرنے!
ہرے کرشن، ہرے کرشن، ہرے کرشن۔

۴

بڈھا پجاری مر گیا۔
مندر کے گھنٹے شور کر رہے ہیں۔ پجاری رو رہے ہیں۔ عورتیں بین کر رہی ہیں۔ بائیاں تھالیوں میں پھول سجائے اس کی سمادھی کی طرف جا رہی ہیں۔ دن بھر زائرین کا تانتا سا لگا رہا ہے۔
اب رات ہو گئی ہے۔
ٹیلے سو گئے ہیں، سادھو اپنی سمادھی میں سو گیا ہے۔ بیس ہزاری کے چھوٹے ننھے ننھے گھروں میں ننھے ننھے زندگی کے بلبلے سو گئے

ہیں۔ کائنات کی حرکت تھم سی گئی ہے۔
صحن میں نوجوان پجاری اکیلا بیٹھا ہے۔ آج اُس نے بھنگ پی ہے، چرس پی ہے، شراب پی ہے پھر بھی اُس کا غم غلط نہیں ہوا۔
"گورو" میں آہستہ سے اُس کے قریب جا کر کہتا ہوں۔ اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔
وہ آہستہ آہستہ رونے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ انگوچھے سے آنسو پوچھتا جاتا ہے۔
"تمہیں کیا تکلیف ہے گورو؟"
"میں گدّی چاہتا ہوں، میں عورت کا جسم چاہتا ہوں، میں ہوٹل کا کھانا چاہتا ہوں، میں اپنی آتما سے ہر لالچ کو دُور کرنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں میں کیا چاہتا ہوں!"
"تو گدّی چاہتا ہے، ہوٹل کا کھانا چاہتا ہے" کوئی اس کے سر کے اوپر آ کے کہتا ہے۔ ہم دونوں گھوم جاتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کا پجاری خشمگیں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ کے کہتا ہے" اس مندر میں واسنا کے بھکاریوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نکل جاؤ یہاں سے ابھی"
نوجوان پجاری سیدھا تنا کھڑا ہے۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئی ہیں۔ اس کا جبڑا ایک چٹان کی طرح جم گیا ہے۔ وہ رک رک کر کہتا ہے "تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ چلا جا یہاں سے"

باوا لچھمن ناتھ بھاگ جاتا ہے۔

مہمان خانے میں روشنی ہے۔

نوجوان پجاری کے قدم مہمان خانے کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ ایکدفعہ میری طرف دیکھتا ہے، پھر سر ہلا کے آگے بڑھ جاتا ہے، آگے، آگے، پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ وہ بڈھے پجاری کی پھولوں سے ڈھکی ہوئی سمادھی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اب وہ مہمان خانے کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ وہ اندر داخل ہو جاتا ہے۔ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

پھر روشنیاں گُل ہو جاتی ہیں۔

ٹیلے سو گئے ہیں۔ سادھو اپنی سمادھی میں سو گیا ہے۔ بیس ہزاری کے چھوٹے ننھے ننھے گھروں میں ننھے ننھے زندگی کے بلبلے سو گئے ہیں کائنات کی حرکت تھم سی گئی ہے۔

۵

دوسرے روز پتہ چلا کہ باوا لچھمن ناتھ کو راتوں رات کسی نے قتل کر دیا۔ پولیس نے نوجوان پجاری پر شبہ کیا، اور تینوں بائیوں پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ آخر میں تینوں بائیوں کو چھوڑ دیا گیا، اور نوجوان پجاری پر مقدمہ چلایا گیا، قتل کے الزام میں۔ مگر ثبوت بہم نہ پہنچنے پر

اُسے بھی رہائی مل گئی۔ رہا ہوتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باوا لچھمن ناتھ کی سمادھی خود اپنی زیر نگرانی تیار کروائی۔ اب وہاں تینوں بائیاں شب و روز پھول چڑھاتی ہیں۔

جودھپور سے تینوں بائیوں کو واپس آنے کے لئے وہاں کے مندر کے پجاری نے لکھا تھا مگر نوجوان پجاری نے اُنہیں بھیجنے سے انکار کر دیا کیونکہ دلّی میں دھرم گیان کے چرچے کی بڑی ضرورت ہے۔ نوجوان پجاری نے لکھا اگر تمہارے پاس ایسی بائیاں دو چار اور ہوں تو اُنہیں بھی دلی بھیج دو۔

اس پر جودھپور کا پجاری چپ ہو گیا۔

مٹھ نے اتفاق رائے سے نوجوان پجاری کو اپنا گورو تسلیم کیا۔ کیا ہوا اگر اُسے گائتری منتر کا جاپ نہیں آتا تھا۔ وہ اب بڈھے پجاری کی بے شمار دولت کا مالک تھا۔ وہ دولت جو بڈھے پجاری نے بنک میں نہیں اپنی کوٹھری کے اندر دبا کے رکھی تھی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"یونہی۔ بیٹھے بٹھائے بھگوان نے مجھے سُجھا دیا۔ منجھلے باوا کوٹھکانے لگا کے جب میں بڑے پجاری کی کوٹھری میں گھسا تو اچانک بھگوان نے مجھے سُجھا دیا۔ ایک ہاتھ اشارہ کر رہا تھا کہ اس کوٹھری میں کچھ ہے۔ اسے کھودو، اسے کھودو۔ اگر اُس وقت راتوں رات میں کوٹھری نہ کھودتا تو یہ دفینہ مجھے کیسے ملتا، میں مقدمہ کیسے لڑتا،

اس گدّی کا مالک کیسے بنتا"۔
گدی کا مالک اس نے ایسے فخریہ لہجے میں کہا معاً میری نگاہوں کے آگے اک ملاقاتی کارڈ گھوم گیا

بھیروں کا مندر لمیٹڈ
(شاخیں)
لاہور - دلّی - جودھپور - روڑکی
پروپرائیٹر :- باوا من ناتھ گوسائیں

اُسی وقت میں نے چلا کر کہا "مل گئے! مل گئے! مل گئے!"
"کیا ہوا؟" سادھو نے گھبرا کر پوچھا۔
میں نے اپنے گھر کی طرف بھاگتے ہوئے کہا "مجھے بھگوان مل گئے مل گئے، مل گئے!"

۶

گزشتہ پندرہ سال سے میں بمبئی میں مقیم ہوں۔ یہاں جُوہُو کے پاس میرا اپنا بھیروں کا مندر ہے۔ ایک مندر میں نے سورت میں، اور ایک احمد آباد میں تعمیر کیا ہے۔ آنند پور میں بائیوں کا

مٹھ کھولا ہے۔ ہندوستان بھر میں ایسی خوبصورت سادھنیاں
آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ ہر سال آٹھ مہینے کے لئے یہ بائیاں ہندوستان
کا دورہ کر کے روپیہ اور دوشالے اکٹھے کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہندوستان
کے تقسیم ہو جانے سے بڑا فساد پھیلا۔ لاکھوں مسلمان مارے گئے لیکن
میرے مندروں کی آمدنی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ ہاں بچارے دلی والے
گروجی کا ایک مندر مارا گیا، بھیروں کا مندر جو لاہور میں تھا۔ اس پر
گوروجی کہاں چوکنے والے تھے۔ انہوں نے فوراً دلی میں ایک مسجد
پر قبضہ کر لیا اور وہاں بھیروں جی کی مورتی استھاپت کر دی۔ شرنارتھی
لوگ جگہ جگہ دلی، بمبئی، جودھپور، احمد آباد، ہر بڑے شہر میں جا کے
اپنی مدد کے لئے بھکشا مانگتے ہیں، لیکن جو بھکشا میری بائیوں کو
ملتی ہے اس کا پچاسواں حصہ بھی ان شرنارتھیوں کو نہیں ملتا۔
شاید ہزاروں عورتوں نے مجھ سے بھگوان سے ملانے کے لئے کہا
ہوگا۔ جن کے نصیب اچھے تھے اُنہیں بھگوان مل گئے۔ اور ہمارے
بھگتوں کی شردھا بھی بڑھتی گئی۔ اب میں اپنا کاروبار بڑھانے کی
سوچ رہا ہوں۔ امسال ارادہ ہے کہ ایک فلم کمپنی بھی کھول ڈالیں اور
کالبادیوی روڈ پر ایک گنیش جی کا مندر بنا ڈالیں۔ کالبادیوی روڈ پر
لکھ پتی گجراتیوں اور مارواڑیوں کا دھندا چلتا ہے۔ اور یہ لوگ گنیش جی
کے عاشق ہیں۔ امید ہے یہ مندر خوب چلے گا۔ بڑے بھائی صاحب
کو چٹھی لکھی ہے۔ اُن کی رائے آنے پر کام شروع کروں گا۔ اب میں

بڑے بھائی جی کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ انہوں نے مجھے دھرم گیان کا سچا راستہ دکھایا ہے۔ اگر اپنی راہ چلتا تو اُسی طرح بیکار دہریہ رہتا اور سوشلزم کی بیکار نکمی کتابیں پڑھکر نرک میں جاتا۔ ہرے کرشن! ہرے کرشن!! ہرے کرشن!!!

دن بڑا ہی خوبصورت تھا۔ ابھی پَو پھٹی نہ تھی، اور آسمان
پر اُفق کے چاروں طرف کنارے کنارے پہاڑوں کی سیاہ نکیلی
چوٹیوں کے اوپر بدلیوں کے لچھّے اُلجھے ہوئے تھے۔ مغرب میں بدلیوں
کی روئیں گہری ہوتی ہوتی ایک جامد غبار بن گئی تھیں اور مغرب
میں پہاڑوں کی کنواری چوٹیاں اس سیاہ غبار میں یوں اُبھری
ہوئی تھیں جیسے سیاہ انگیا میں جوانی کے کنول۔ اور پھر بادلوں کے
سیاہ لچھّے اس غبار کے شمال مشرقی کونے سے اٹھتے ہوئے دور پورب
تک پھیلتے گئے تھے، پھیلتے گئے اور لچکیلے اور چمکدار ہوتے گئے۔ اور سورج
کے منبع کے پاس جا کے بالکل غائب ہو گئے۔ اس منبع کے پاس مطلع
اتنا صاف تھا کہ شمع کی لَو کا دھوکا ہوتا تھا۔ شمع بستر کے کنارے

جگ رہی تھی اور رات اپنی زلفیں پھیلائے ابھی تک سو رہی تھی،
اور شمع کا اجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے تو چوٹیوں کے شبنمی ہونٹ بادلوں
سے الگ ہوئے۔ کیسی مجبوری تھی اُن میں، جیسے وہ ہونٹ اس طویل
بوسے سے الگ نہ ہونا چاہتے ہوں۔ پھر اک سپید سنہری ضیا منبع سے
اُبل کر آسمان کے چھپّر پر دوڑ گئی، جیسے رات سوتے میں مسکرا اُٹھے
کتنی ہلکی لطیف سی مسکراہٹ تھی وہ۔ پھر کہیں سے ایک پرندہ چہچہایا
کُوکُو، کُوکُو۔ گُکُو تھا، اور میٹھے مدھّم غنودگی سے لبریز لہجے میں بول
رہا تھا۔ کُوکُو، کُوکُو۔ جیسے سویا ہوا بچہ جاگتے وقت کنمنائے، کُوکُو۔ بگلوں
کی ڈار کھلی قینچی کی طرح پرواز کرتی ہوئی خاموشی سے گذر گئی۔ پھر اک دم
بہت سے پرندے چہچہا اُٹھے۔ ایک کوّا چیخا، اک گُلدم گائی، اک تیتر
بولا، اک کھٹ بڑھئی نے تال دی۔ اور پھر چاروں طرف پرندوں کی
چہچہاہٹ ہی سُنائی دینے لگی۔ اور رات کی زلفوں کو شمع کی لَو
نے چھو لیا، اور زلفیں پھسلتے پھسلتے بالکل مغرب میں چلی گئیں۔ اور
پھر اک دم اُجالا ہو گیا۔

لیکن یہ سورج کا اُجالا نہ تھا، سورج کی آمد سے پہلے کا
نور تھا جب رات جاگتی ہے اور سحر ہولے ہولے قدموں سے پلنگ کے
پاس آجاتی ہے، اور لجائی ہوئی نگاہوں سے سوئے ہوئے دن کو دیکھتی
ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سارے آسمان پر تھیں اور
ساری دھرتی پر تھیں، اور اس کی محبوب مدماتی مسکراہٹ ساری کائنات

پر تھی۔ اور اب آسمان کانچ کی طرح نازک، نیلا اور شفاف تھا، اور اُجالے میں ایسی لرزش تھی گویا یہ کانچ اب گرا کہ اب گرا، اور دھرتی چھنن سی آواز کی منتظر تھی۔ بے شکن کانچ کی سطح اس قدر نازک تھی کہ ڈر تھا کہیں اُڑتے ہوئے مگلوں اور کوؤں اور گٹاریوں کی تیز نکیلی چونچیں اس میں سوراخ نہ پیدا کر دیں۔ اور کہیں یہ براق اُجالا سوراخوں سے بہہ کر ختم نہ ہو جائے۔ پھر جیسے یہ کانچ اور اوپر اٹھ گیا، اور بسنت کی لکیر پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر اوپر چاروں طرف پھیل گئی۔ اس سپید براق اجالے میں کسی نے زعفران کی ہوائی بکھیر دی۔ اور یہ ہوائی لہراتی ہوئی بل کھاتی ہوئی اپنے آپ کو اس اجالے میں گھولتی ہوئی افق کے کنارے سے کنارے چاروں طرف پھیل گئی۔

گاؤں ابھی سو رہا تھا۔ چشمے کا پانی ایک ہی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ لکڑی کے نل سے لیکر پتھر کی سل تک پانی کی ایک لکیر سی کھنچی ہوئی تھی۔ جھاڑیوں پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ درخت دُھند میں لپٹے ہوئے مدہوش تھے۔ اُن کے تنوں پر اوس کی بوندیں آہستہ آہستہ سرک سرک کر ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی نیچے بہتی جا رہی تھیں، اور رہ گزر کے نیلے پتھر اُن کے پانیوں سے دھوئے گئے۔ اور جانوروں کے قدموں سے دبی ہوئی خاک سیراب ہو گئی، اور آسودہ ہو کر دن بھر کی مشقت کا انتظار کرنے لگی۔ ساری دھرتی آرام کا سانس لے

رہی تھی، اور یہ سانس اک اجلے اجلے دھوئیں کی صورت میں فضا پر چھایا ہوا تھا۔

گھر سو رہا تھا۔ گھر کے پیچھے چیڑھ کے درخت پر گھاس کا گھاٹڑا رچا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے مولیشی خانہ تھا۔ کہیں آواز نہ تھی باہر دالان میں دادی کمبل اوڑھے سو رہی تھیں۔ جب چیڑھ کے درخت پر رت گلا چھپایا اور گھر کے سامنے آڑو کے پیڑ پر کھٹ بڑھئی نے کھٹکھٹانا شروع کیا تو دادی نے کروٹ بدل کر کھانسنا شروع کیا۔

"بختیار۔ بختیار بیٹا، فجر ہو گئی"

"اوں ہوں" کوئی ڈورا اپنی چارپائی پر سرکا۔ پھر خراٹے لینے لگا۔

"کیسی ظالم نیند ہے۔ مولیشی باڑی میں بھوکے مرے جا رہے ہیں اور یہ سب لوگ سو رہے ہیں۔ ارے بختیار، بختیار بیٹا، فجر ہو گئی"

"باپا!" کوئی ڈور بستر پر ڈکارا۔

"بیگماں، بیگماں۔ تو ہی اٹھ جا"

"آئیں ایں اوں" بیگماں اپنے گرم گرم بستر میں کسمسائی، اور اس نے اپنے دودھ پیتے بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔ بچہ جس مزے سے دودھ پینے لگا اس سے بیگماں کو اور بھی گہری نیند آ گئی۔

"مرجائی بیٹی، او فکرو، ارے کوئی تو اٹھے"

مرجانی کا سر کھلا تھا، اُس کا منہ بھی کھلا تھا اور اس کی قمیص بھی اتنی کھلی تھی کہ گردن کے نیچے اونچی گھاٹیوں کے بیچ کی گہرائی اپنی حیرت انگیز سپیدی، نازکی اور کانچ کی سی خوبصورتی لئے نظر آرہی تھی۔ جیسے آسمان پر اُجالا تھا ایسا ہی اُجالا مرجانی نے اپنی قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اور اس کے ہاتھ بھی بے دھڑک کھلے پڑے تھے۔ اور وہ اپنی خوبصورتی، اپنی جوانی، اپنے الھڑپنے سے بے خبر سو رہی تھی۔ دادی اماں دیر تک اسے گھورتی رہیں، اور پھر انہوں نے غصے میں اُسے ایک لات جمائی اور مرجانی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"کیا ہے، کیا ہے!"

"کیسی بے خبر سوتی ہے، غافلوں کی طرح، پنڈا نہیں چھپا سکتی، کم ذات"

"تو میں کیا کروں دادی اماں" مرجانی نے اپنے سینے پر قمیص کے پھٹے ہوئے کونوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چل اُٹھ۔ مٹکی دھو کر مویشی خانے میں جا، اور دودھ دوہ کے لا"

مرجانی لڑکھڑاتی سی اٹھی۔ اُس کے ہاتھ کے کنگن بج اٹھے۔ اس کے بالوں میں کانچ کی سُریاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں اور نغمہ مرجانی کی مسکراہٹ کو چومتا ہوا فضا میں بکھر گیا۔

"ہائے دادی اماں تم تو صبح سویرے ہی جگا دیتی ہو۔ اتنا اچھا سپنا

دیکھ رہی تھی"
"سپنے دیکھتی ہے۔ رات کو کم کھایا کر۔ چار چھ روٹیاں مکئی کی کھا جائے گی تو خواب نہیں آئیں گے تو کیا فرشتے آئیں گے رات کو کم بخت"

مرجانی نے دالان کے تھم سے ٹھوکر کھائی۔ پھر سنبھلتے سنبھلتے بھی مٹکی اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اور وہ دادی اماں کی طرف دیکھ کے آنکھوں میں آنسو لا کے کہنے لگی۔ "مٹکی ٹوٹ گئی"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ خدا تجھے کسی جولاہے سے بیاہے، اور تو زندگی بھر سوت کی انٹیاں گھما گھما کر مرجائے، مگر تجھے پھر بھی سوت نہ آئے۔ چل وہ دوسری مٹکی لے اور بھاگ"

مرجانی بڑبڑاتی، بکتی جھکتی، گھر کے پیچھے مویشی خانے کی طرف چلی گئی۔

دادی زور زور سے کھانسنے لگیں لیکن کوئی نہ اٹھا۔ صرف گود کا بچہ دادی اماں کی تلخ کھانسی سے ڈر کے چیخنے لگا، اور بیگماں اُسے تھپک تھپک کے سلانے لگی۔ اور دادی اماں نے چیخ کر کہا۔
"اب کب تک اپنے جگر کے ٹکڑے کو پچکار پچکار کر سلائے جائیگی۔ کیا سورج چڑھے گھر میں آگ جلائے گی۔ بیگماں جب میں تیری عمر کی تھی تو ـــــــ"

بیگماں بچے کو اٹھائے اٹھائے باہر آئی "اوہ سچ مچ فجر ہو گئی"۔

اُس نے حیران ہو کر اتنے بڑے اُجالے کی طرف دیکھا۔ "اب سورج نکلا ہی چاہتا ہے۔ بچے کو لے لو اماں، میں چشمے سے پانی لے آؤں"۔ اس نے گھڑا اٹھایا اور چشمے کی طرف بھاگی۔

" اری بھاگتی کیوں ہے، ابھی دو مہینے تجھے بچہ جنے نہیں ہوئے۔ آہستہ چل" دادی نے غصے میں کہا۔ اور بیگماں نے ہنس کر اپنی رفتار کم کرلی۔ "اللہ سمجھے آجکل کی لڑکیوں سے۔ اب یہ پانچواں بچہ ہے اس کا، مگر عقل ابھی تک نہیں آئی۔ اللہ جانے کب آئے گی۔ اوں اوں سوجا میرے ننھے بختیار کے ننھے پوت"

ننھا بختیار جس کی عمر اس وقت چالیس سال سے کچھ کم نہ ہوگی، ابھی تک چارپائی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ کمبل کا ایک سرا اس کے ہونٹوں کے پاس پھڑک رہا تھا، اور جب بختیار سانس باہر نکالتا تو یہ سرا اوپر اُٹھ جاتا، اور جب بختیار سانس اندر کھینچتا تو یہ سرا اس کے ہونٹوں کے اندر گھس جاتا۔ دادی اماں دیر تک بچے کو جھلاتی ہوئی اپنے بیٹے بختیار کو دیکھتی رہیں۔ بختیار کے چہرے پر داڑھی تھی جس سے اس کے رخساروں کے گڑھے چھپ گئے تھے۔ بختیار کی آنکھوں کے کونوں پر جھریوں کے دائرے بننے شروع ہوگئے تھے، اور اس کے ماتھے کی لکیریں گہری ہوتی جارہی تھیں۔ لیکن دادی اماں کو بختیار اسی طرح اک ننھا بچہ نظر آرہا تھا۔ وہی بچپن کی معصوم ادائیں، لڑکپن کی شرارتیں،

بختیار کا بیاہ، اُس کے طاقتور بازوؤں کا سہارا جیسا دادی اماں نالے میں گر پڑی تھیں۔

"بچے اُٹھ" دادی اماں نے شفقت سے کہا۔

" اوں ہوں" بختیار نے کروٹ بدل لی۔

" ابے اٹھتا ہے کہ نہیں"

بختیار نے سانس اس زور سے کھینچا کہ کمبل کا ٹکڑا تالو تک گھس گیا، اور وہ آخ تھو کرتا کرتا اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

دادی نے بچے کو پلنگ پہ لٹا دیا، اور جھاڑو ہاتھ میں لے کے دالان صاف کرنے لگیں۔ دو مرغیاں کُڑ کُڑ کرتی ہوئی دادی اماں کے قریب آئیں۔ دادی نے غصے میں جھاڑو دکھائی تو وہ کڑوں کڑیں کرتی ہوئی باہر بھاگیں۔ مرغ نے اُن سے کہا۔ کیا لینے گئی تھیں اس بڑھیا جھلساؤ کے پاس۔ منع کرنے پر بھی ادھر ہی جاتی ہو" مرغ نے بڑی مرغی کو ٹھونگتے ہوئے کہا۔ اور بڑی مرغی بھاگی اور چھوٹی مرغی بھاگی اور مرغ ان دونوں کے پیچھے بھاگا، اور وہ بھاگتے بھاگتے جنگلی بیروں کے جھنڈ میں جا کے چگنے لگے۔

بچہ رونے لگا، ابھی انگوٹھا چوس رہا تھا، یا ابھی اس طرح ڈھاریں مار مار کے رونے لگا گویا اس پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ قلرو کی نیند حرام ہو گئی۔

" دادی اماں اسے چپ کراؤ"

"نہیں تم پڑے پڑے سوتے رہو۔ جب دن نکلیگا جب اٹھنا۔ کیسے کاہل کسان ہیں۔ کہتے ہیں، دن بھر کمائی کرتے ہیں پھر بھی کچھ نہیں ملتا۔ ملے کیسے ملے۔ اللہ جاگ گیا۔ سورج نکلنے کو آیا۔ مگر تمہاری نیند ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی۔ ایسی حرام کی کمائی میں خدا کیسے برکت دے۔ جب خدا بخشے بختیار کا باپ زندہ تھا تو تیسرے پہر مرغ کی پہلی بانگ سے اُٹھ جاتا، اور ہل لیکر کھیتوں میں چلا جاتا۔ اور دھان کے موسم میں بھی گھٹنے گھٹنے ٹھنڈے تخ پانی میں کھڑا پنیری لگاتا۔ اور ایک تم ہو، نہ کام آئے نہ موت آئے"۔

فکرو دادی کی صلواتیں سُنتا سُنتا اُٹھ بیٹھا، اور جمائی لے کر بے فکری سے مسکرانے لگا۔ گو اس کا نام فکرو تھا مگر جہان بھر میں اُس سا بے فکر کسان کہیں نہ ہوگا۔ اُس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے، اور اُسے دادی اماں نے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ قد میانہ لیکن جسم گٹھا ہوا تھا۔ مضبوط ہاتھ پاؤں اور مضبوط کشادہ چھاتی، اور مضبوط جبڑے۔ وہ اس گھر کا ہالی تھا اور دس کسانوں جتنا کام کرتا تھا۔ اور کام کرتے کرتے گاتا بھی تھا، اور گاتے گاتے ناچنے بھی لگتا، اور ناچنے کے بعد ہنسنے لگتا، اور ہنستے ہنستے پھر کام میں مشغول ہو جاتا۔

بختیار ہل اُٹھائے باہر نکلا۔ "سلام اماں"۔ اس نے ادب سے کہا۔ ایک نگاہ فکرو پر ڈالی۔

فکرو نے کہا " تم چلو۔ میں گوڈی کا سامان لے کے اور مویشیوں کو چارہ کھلا کے آتا ہوں۔ آج جانے اتنی دیر تک کیوں سویا رہا۔"

" تم سے ہزار بار کہا ہے، کم کھایا کرو۔ آخر اپنے گھر کا اناج ہے، کہیں ختم تو نہیں ہو جائے گا۔ اپنے گھر کی زمین ہے، کہیں اُسے چور تو اٹھا کر نہیں لے جائیگا۔ ایسے بھُک مرے کی طرح آٹھ دس روٹیاں رات کو کھا جاتا ہے جیسے پھر کبھی روٹی نہیں ملے گی۔"

فکرو نے کہا " بہت بھوک لگی ہے اماں"

" جا! جا! کام کر"

فکرو اپنا کھر درا جبڑا سہلاتا سہلاتا اٹھا، اور اُٹھ کر آنگن سے باہر نکلے میں ناشپاتی کے درخت کے نیچے پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔

دادی چیخیں " ارے تجھ پر اللہ کی سنوار۔ پھلدار پیڑ ہے۔ تجھے لاکھ بار کہا ہے وہاں مت بیٹھا کر۔ اٹھتا ہے کہ جھاڑوں ماروں۔ ہر بار۔ ہر روز۔"

فکرو اسی وقت وہاں سے اٹھا اور آگے سنبلو کی جھاڑیوں کے سامنے بیٹھ گیا۔ پیشاب کر کے ہنستا ہوا اٹھا تو باہر مٹکے سے پانی لے کر ہاتھ دھونے لگا۔ " اماں، کچھ ٹکڑ روٹی کا ٹکڑا، دیدے۔ تیرے سر کی قسم بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

" بیگماں ابھی چشمے سے پانی لاتی ہوگی۔ آنے دے، پھر ٹکڑ اور لسی دیتی ہوں۔ جا جب تک کام کر۔ بیچاری مر جانی اکیلی مویشی خانے میں سب جانوروں کو کیسے سنبھالے گی۔"

بچّہ زور زور سے رو رہا تھا۔ بیگماں گھڑا اُٹھائے سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ پانچ بچوں کی ماں ہونے کے بعد بھی چال میں جوانی کی تمکنت تھی، اور کمر میں ہرنی کا وحشی پن تھا، اور گالوں میں غازے کے بغیر بھی سُرخی تھی، اور کاجل کے بغیر بھی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ اور سینہ پہاڑ کی چوٹیوں کی طرح اُبھرا اُبھرا۔ بچے کو روتے دیکھ کر وہ ہونٹ کٹکٹانے لگی۔ گھڑے کا پانی چھلک کر زلفوں پر بہہ کر گالوں پر آ گیا تھا۔ اور اس کے گال غصے سے چمک رہے تھے، اور اس کا تنفس تیز ہوتا گیا۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا، اکیلا، کھاٹ پر۔ اور دادی اماں اندر دوسرے بچوں کو جگا رہی تھیں۔ کان پکڑ کر اٹھا رہی تھیں، طمانچے لگا رہی تھیں، کھٹیا اٹھا رہی تھیں۔ اور بچے چیخ رہے تھے، اور رو رہے تھے، اور ہنس رہے تھے، اور دادی اماں کے گرد گھوم رہے تھے، اور مرغ کُڑکُڑا رہے تھے، اور بکریاں منمنا رہی تھیں، اور مویشی خانے میں گائیں ڈکرا رہی تھیں۔ بیگماں نے آتے ہی گھڑا سر سے اُتارا، اور روتے ہوئے بچے کو جلدی سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بچے دادی اماں کے گرد ناچتے ہوئے باہر آ گئے۔ بیگماں نے لال بھبوکا ہو کے دادی اماں کی طرف دیکھا۔

"بچہ اکیلا پڑا تھا"

"ہاں" دادی پھنکاریں۔

"کھاٹ پر پڑا تھا۔ رو رہا تھا۔ اکیلا۔"

"سُن لیا" دادی چیخیں۔
"اگر کوئی اسے اُٹھا لے جاتا"
"ہاں بھگیاڑ (بھیڑیا) آ رہا تھا اسے اُٹھانے کے لئے یہاں۔
"ہائے، اسے بھگیاڑ کیوں لیجائے۔ بھگیاڑ لیجائے تیرے ایسے بڈھے کھکھیاڑ
کو" بیگماں نے جھلا کر کہا۔
دادی چلائیں "میں بڈھی ہوں، کھکھیاڑ ہوں۔ تو بڑی جوان ہے۔
پانچ بچوں کی ماں ہے اور کیا ابھی تک، سولہ برس کی کنواری کی طرح
مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ اور دیدے گھما گھما کر تو یوں چاروں طرف
تکتی ہے جیسے سارا گاؤں تجھ ہی پر مرتا ہے۔ اُس روز جعفر علی سے
کیا باتیں ہو رہی تھیں چشمے کے کنارے؟"
"ہائے اماں کیا بہتان لگاتی ہو۔ چچا جعفر علی تو تمہاری عمر کا ہے۔ وہ تو
مجھ سے میرے بال بچوں کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ بڑا میلا دل ہے تمہارا
دادی اماں"
"میرا دل میلا ہے، اور میں بڈھی ہوں، کھکھیاڑ ہوں۔ اور تو بڑی
حُور پری ہے، نیک ذات ہے۔ تیرے بچوں کو کھلاؤں، جگاؤں،
تیرے گھر کو دیکھوں، دالان میں جھاڑو دوں، سب کو کھانا کھلاؤں،
اور پھر بھی میرا دل میلا ہے؟" دادی رونے لگیں۔
بیگماں نے آبدیدہ ہو کر کہا "تم تو یونہی جھگڑتی ہو اماں، میں نے تو
بچے کو روتے دیکھا تو یونہی کہہ دیا۔ میں چشمے سے پانی لا رہی تھی، یہ باہر

رو رہا تھا۔"

"یہ باہر رو رہا تھا تو میں کہاں مری جا رہی تھی۔ سارے گھر کو جگایا، تجھا ڑو دی، اب تیرے بچوں کو جگا جگا کے لا رہی تھی کہ ان معصوم جانوں کے منہ میں دو ٹکڑ دے دوں، کہ تو نے طغان (طوفان) اُٹھالیا۔ ایسی بھی کیا آخیر آ گئی۔"

دادی رونے لگیں۔ بچہ رونے لگا۔ دادی نے جھٹ اُسے بیگماں سے چھین لیا اور روتے روتے اُسے لوری دینے لگیں۔ بیگماں کے جھکتے ہوئے آنسوؤں میں مسکراہٹ چھلک پڑی، جیسے گھومتے ہوئے بھنور میں سورج کی کرن چمک چمک جائے۔

دادی نے کہا "جا اُپّی بنا دے اور ٹکڑ دیدے سب کو" دادی اماں آنگن سے نکل کر چیڑ کے درخت کی طرف چلی گئیں۔

مویشی خانے میں ابھی اندھیرا تھا، اور سوکھی چیڑ کا تلخ دھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ مرجانی نے مویشی خانے کی گرم گرم فضا میں اطمینان کا سانس لیا۔ اُس نے مٹکی بڑے طاق میں رکھدی، اور مویشیوں کو چارہ ڈالنے میں مصروف ہوگئی۔ گائیوں کو چارہ ڈالا، پھر بچھڑوں کو سہلایا، پھر بھینسوں کو چارہ ڈالا، پھر کٹّوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر بکریوں کے باڑے کی طرف گئی اور سہلانے لگی۔ ایک لیلا اسے بہت پسند آیا۔ وہ دیر تک اُسے گود میں اُٹھائے چومتی رہی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُسے دودھ دہنا ہے، اور اُس نے

مٹکی طاق سے اُٹھائی اور لے لے کو بکری کے حوالے کیا اور بَلی گائے کو دہنے کے لئے تھنوں کے پاس جا بیٹھی۔
دودھ کی پہلی دھار مٹکی میں جا گری اور مٹکی خوشی سے گنگنا اٹھی۔
دُھر دُھر دھاں دھاں، دُھر دُھر دھاں دھاں۔
تازے دودھ کی دھاریں مٹکی میں چھوٹے چھوٹے فواروں کی طرح جا رہی تھیں۔ اور جب مٹکی آدھی سے زیادہ بھر گئی تو مرجانی دودھ کی دھاروں کو اپنے منہ کی مٹکی میں ڈالنے لگی۔ اور پھر کسی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور دودھ کی اس کی آنکھوں میں جا پڑی، اور اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اُس نے دودھ کی مٹکی زور سے اپنی رانوں میں دبالی، اور بغیر مڑے کہا " فکرو چھوڑ دو مجھے "
فکرو نے کہا " ہم بھی دودھ کی دھاریں لیں گے "
" تو جاؤ اتنی گائیں بھینسیں کھڑی ہیں، شوق سے پیو۔ ہمیں کیوں پریشان کرتے ہو "
" نہیں ہم تو اسی گائے سے دودھ کی دھاریں لیں گے "
" تو، لو "
مرجانی نے مٹکی اُٹھا کر طاق میں رکھ دی اور الگ کھڑی ہو گئی۔ فکرو بھی اُس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دودھ کی دھار ابھی تک مرجانی کے بائیں رُخسار پر بہہ رہی تھی۔ فکرو نے اس رُخسار کو چوم لیا۔
" بہت میٹھا ہے۔ آہاہا! "

مرجانی نے اُسے ایک طمانچہ رسید کیا "گنوار، وحشی"
بجلی کی سی تیزی کے ساتھ فکرو نے اُسے پکڑ لیا۔ اسے اپنی باہوں میں
بھینچ لیا، اور اپنے ہونٹ اس زور سے ملا دیئے کہ مرجانی کا چہرہ پیچھے
کی طرف ڈھلک گیا۔ اور اس کے بال مویشی خانے کے فرش سے
جا لگے اور اس کی گردن صراحی کی طرح خمیدہ ہو گئی، اور اُس کے
بازو سہرکتے بے جان سے ہو کے گر پڑے۔ پھر یکایک فکرو نے
اُسے چھوڑ دیا، اور وہ گرتے گرتے بچی۔
"میں ــــ میں ــــ دادی اماں کو ــــ اماں بیگماں کو ــــ"
مرجانی کا سانس رُک رہا تھا "بلاتی ہوں ــــ ابھی ــــ ابھی
بلاتی ہوں"۔
"خدا کے لئے" فکرو پشیمان ہو کے بولا "خدا کے لئے"
"نہیں میں تو ــــ اے دادی ــــ" فکرو نے جھٹ اُس کے منہ پہ
ہاتھ رکھ دیا "تجھے گیارھویں والے پیر کی قسم ہے"
"اچھا تو وعدہ کرو کہ کبھی نہیں آئندہ"
"وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی نہیں آئندہ"
"اور وعدہ کرو کہ جھلّے پیر کے میلے پر مجھے ایک ہنسلی خرید دو گے"
"وعدہ کرتا ہوں کہ جھلّے پیر کے میلے پر خرید دوں گا"
"کیا خرید دوں گا" مرجانی نے شبہ کی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے
کہا "نام تو لیا نہیں تم نے"

"بہی، ایک ہنسلی خرید کر دوں گا تمہیں"
"ہاں" مرجانی کو جیسے اطمینان سا ہو گیا "لو۔ اب آؤ۔ تمہیں دودھ کی دھاریں بلّی گائے سے دلواتی ہوں۔ مگر دیکھو۔ ایں!" مرجانی نے انگلی اٹھا کے کہا "پھر شرارت کی تو پٹو گے"
مرجانی دیر تک بلّی کے تھنوں سے دودھ دہتے ہوئے دودھ کی دھاریں فکرو کے منہ میں ڈالتی رہی، اور فکرو دیر تک دودھ کی دھاریں مرجانی کے منہ میں ڈالتا رہا۔ کبھی یہ، کبھی وہ۔ اور وہ دیر تک ہنستے رہے اور باتیں کرتے رہے اور دیر تک دروازے پر کھڑی دادی اماں اُنہیں دیکھتی رہیں۔ لیکن وہ دونوں مدہوش تھے کہ انہیں دادی اماں کی آمد کا پتہ بھی نہ چلا۔ آخر دادی اماں غصے میں چلائیں۔
"اللہ کرے تمہیں موت آجائے۔ مردودو، بے شرمو، بے حیاؤ! ابھی شادی ہوئی نہیں، اور پہلے ہی سے ——"
دادی اماں بکتی جھکتی جا رہی تھیں لیکن مرجانی اور فکرو نے صرف ایک بار گھوم کے دیکھا اور پھر مرجانی بھاگ کر اُٹھی اور دُور پرے مویشی خانے کے دوسرے سرے پر جا کر کسی بھینس کا دودھ دہنے لگی۔ اور اس سرے پر فکرو سر نیچا کر کے دودھ دہنے لگا۔ اور دادی اماں بکتی جھکتی رہیں، لیکن ان کی باتوں میں جیسے اب تلخی نہ تھی، غصہ نہ تھا۔ ان کی گالیوں میں جیسے یکا یک کہیں سے مٹھاس آگئی تھی۔ اور پھر کسی خاموش نغمے کا راگ جنگلی جھرنے کی طرح پھوٹ کر بہہ نکلا۔ اور دادی اماں

کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور دادی اماں اپنے پوتے کو اٹھائے آہستہ سے مویشی خانے کے باہر گھوم گئیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، اور جب انہوں نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا تو یکایک جھلملاتے ہوئے افق پر کہیں سے آفتاب نکل آیا۔ اور سارا گاؤں جاگ پڑا۔ اور ساری دھرتی جاگ پڑی۔ اور سورج کی نرم نرم مہربان کرنیں کائنات کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئیں۔

گیت اور پتھر

نفرت بھی ایک قسم کی محبت ہے۔ اعجاز حسین زیدی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ زیدی کو عورتوں سے نفرت ہے، کیونکہ زیدی بدصورت ہے، اور اسے اپنی بدصورتی کا شدید ترین احساس ہے، زیدی ٹھنگنا بلکہ بونا ہے اور اسے اپنے کوتاہ قد ہونے پر فخر نہیں، زیدی کی چال میں ایک قسم کی ناہمواری ہے کہ جسے دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجائے اور جب لوگ اس کا دل رکھنے کے لئے اس پر ہنستے نہیں ہیں، اس کی عزت کرتے ہیں، اس کی آؤبھگت اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں، خاص طور پر اسے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، تو وہ اور بھی خفا اور

برافروختہ ہوجاتا ہے، شاید وہ دل سے چاہتا ہے کہ لوگ اسے بدصورت
ٹھنگنا، بونا کہیں۔ اسے گالی دیں، اس سے دور دور رہیں۔ میں نے
اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اسے پھٹکارتے ہیں وہ ان سے خوش رہتا ہے
اور جو لوگ دل جمعی کی کوشش کرتے ہیں وہ انھیں اچھا نہیں سمجھتا
بلکہ اس کی دل جمعی کی جتنی کوشش کی جائے وہ اتنا ہی کبیدہ خاطر
ہوجاتا ہے۔

میرے مشاہدہ میں زیدی پہلا آدمی ہے جو اس حد تک اذیت
پسند ہے کہ ہر وقت اپنے آپ کو ذہنی طور پر کوڑے مارتا رہتا ہے
زیدی بیسویں صدی کا باشندہ ہے اس لئے ایک فلم کمپنی کا اسسٹنٹ
ڈائرکٹر ہے، اگر وہ سولہویں صدی میں ہوتا تو کیتھولک راہب ہوتا
سخت گیر ملا ہوتا، اسفل ترین محتسب ہوتا، لیکن بیسویں صدی نے اسے
فلم ڈائرکٹر کا اسسٹنٹ بنا دیا ہے، اسے اس بات میں بھی مزا آتا ہے
کہ اس کی تقدیر اس قدر بری ہے، لوگ خوبصورت اشیاء، اچھی
باتوں اور جمالی اوصاف سے حظ اٹھاتے ہیں، زیدی کو دکھ، درد
گناہ، بدصورتی اور اس گہرائی میں دلچسپی ہے جو نیچے جاتی ہے، جو
چیز اوپر اٹھتی ہے جیسے آسمان، درخت کی چوٹی، کبوتر کی اڑان، ان
باتوں میں اس کی دلچسپی قائم نہیں رہتی۔ وہ شر، بدی اور نفرت کا
قائل ہے، اس میں اور فرشتوں میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔
زیدی کو عورتوں سے سخت نفرت ہے، وہ ان کے سامنے

تک سے نفرت کرتا ہے وہ انکو ادنیٰ ترین مخلوق کہتا ہے، شوپن ہار کا پرستار ہے بسٹوڈیو میں جہاں عورتیں کھڑی ہوں گی ہاں کے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آئیں گے۔ لیکن زیدی کبھی وہاں نہ ہوگا، اگر کبھی اسے لڑکیوں کے پاس سے گزرنا پڑے تو وہ اس قدر اکڑ کر اس قدر تن کر چلتا ہے کہ اس کی حالت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جیسے اس کے جسم کا ذرہ ذرہ عورت عورت پکار رہا ہو، بھوک جب اس منزل پر پہنچ جائے تو نفرت بن جاتی ہے، بھوک دراصل زندگی، حرکت، عمل کی علامت ہے لیکن بھوک کی آخری منزل موت، جمود اور سکوت بھی ہے۔ زیدی کی جنسی حسیات اس قدر نازک ہو چکی ہیں کہ شاید اسے مرد کہنا بھی ایک مبالغہ آمیز حقیقت ہوگا۔ زیدی کی مردانگی نے اپنی بدصورتی سے مار کھائی۔ اور یہ بدصورتی عورت کی نسائی جمالیات سے ٹکرا کر نفرت میں مبدّل ہوگئی، اب نہ وہ مرد ہے نہ عورت، سرتاپا نفرت ہے۔ وہ ایک ایسی پریشان روح ہے جس نے اپنے آپ کو الجھا الجھا کر گرہیں لگالی ہوں اور اب ان گرہوں کا کھلنا اس کے لیے نہایت مشکل ہو، شاید اب وہ خط مستقیم کی تاب نہ لاسکے گا۔ زیدی کی یہ حالت ہمارے ملک کے رہنماؤں سے بہت ملتی جلتی ہے۔

زیدی سے اگر کہا جائے کہ فلاں عورت کو سٹ پر حاضر ہونا چاہیئے، تو اول تو زیدی سنی ان سنی کردے گا، دہرانے پر اس طرح گھورے گا گویا آپ نے یہ کہہ کر کسی فعل شنیع کا ارتکاب کیا ہے

اگر آپ زیادہ ڈھیٹ نکلے تو وہ سٹ چھوڑ کر باہر چلا جائے گا اور پھر وہاں سے بلانے کے لئے کسی چپراسی کو بھیجے گا، یا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈے گا۔ چار و ناچار اگر اسے خود جانا پڑے تو لڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر ہوا سے بات کرے گا۔ "سٹ پہ آئیے" اور اس کے بعد یکلخت وہاں سے چلا جائے گا۔ اس کی حرکات میں اس وقت روانی نہیں ہوتی۔ عموماً زندگی میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ہر حرکت میں توازن کا ایک احساس ہوتا ہے۔ زیدی کو دیکھ کر اس وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ انسان نہیں ہے اک بے روح پیکر ہے جو اٹھا کر لڑکی کے سامنے لایا جا رہا ہے، اس کی چال ڈھال، گفتار، اطوار میں ایک عجیب بے ہنگم۔ میکانکی حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ آٹومیٹن کے بے تال افعال بھی شاید اس سے بہتر ہوتے ہوں گے، بالعموم عورتوں کا اثر مردوں پہ بہت ہوتا ہے، شدید ہوتا ہے۔ اور جب تک اعصاب تولید و تخلیق قائم رہتے ہیں، اثر ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن جتنا اثر اس مخلوق کا میں نے زیدی پہ دیکھا ہے اور کسی فرد پر نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیدی کے جسم اور روح کا ہر ذرہ ایک آنکھ ہے اور عورت کے وجود کو دیکھتے ہوئے اس سے منکر ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ لوگ دو آنکھوں سے عورت کو دیکھتے ہیں اور مر جاتے ہیں، زیدی کروڑوں آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کے دل کی کیا حالت ہوگی، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پہنچ کر محبت نفرت میں اور زندگی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

جب ہمارے سٹوڈیو میں رمبھا پہلی بار آئی تو پروڈیوسر سے لے
کر سیٹنگ بوائے تک مسرت سے چہکنے لگے۔ در اصل خوبصورت عورت
خوشی کا ایک لمحہ ہے۔ جو جنت کی وادیوں سے اس سرزمین تک
آتا ہے۔ پھر اس لمحے کو پانے، چکھنے، حاصل کرنے، اس کے لئے مر جانے
کے لئے بیقراری کیوں نہ ہو۔ اور رمبھا تو ایسی عورت تھی جیسے ہنستی لہر، لہکتی ڈالی
دہکتی کلی، جیسے فضا میں تبسم کی کمان کھنچ جائے اور گم ہو جائے اور گم ہونے
کے بعد بھی تخیل میں اس کے رنگ چمکتے رہیں، یہی حال رمبھا کا تھا
عورتیں جوان بھی ہوتی ہیں۔ خوبصورت بھی ہوتی ہیں، شعریت، رس اور
غنائیت سے لبریز بھی ہوتی ہیں۔ لیکن رمبھا کے حسن کی لے دوسری
عورتوں سے بالکل الگ تھی۔ اس کے حسن کا احساس اس کے سامنے
نہیں، اس سامنے سے گزر جانے کے بعد ہوتا تھا، جیسے کوئی چیز چمک
گئی۔ وہ سامنے سے گزر جاتی اور بعد میں یہ خیال آتا، خیال نہیں آتا
تصویریں سی آتیں، پھولوں کے گجرے، قوس و قزح کے رنگ،
بچوں کا تبسم، آسمان کی دھنک، رات کی کہکشاں کے دودھیا شرارے،
موتیوں کی لڑی، یکایک بکھرتی ہوئی، ان سب تصویروں کا خیال
اسے دیکھ کر آتا تھا، اس کا حسن فانی تھا، لیکن اس حسن کی گونج دیرپا تھی
جو تصویریں اس حسن کو دیکھ کر اجاگر ہوتی تھیں، وہ لافانی تھیں خوبصورتی
کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی، رمبھا کو دیکھ کر یہ خیال نہ آتا تھا
کہ یہ عورت فلم ایکٹرس ہے، بیوی ہے، بچوں کی ماں ہے، غم روزگار

اور ذوق نمود کی بیتابی سے آگاہ ہو چکی ہے، وہ جدھر جاتی تھی فضا میں ایک شعلہ سا اڑتا تھا، کئی پروانے خاکستر ہو گئے۔

غیر ممکن تھا کہ ایسے وجود سے زیدی کو نفرت نہ ہوتی، تحت الثریٰ کا رہنے والا بلندی سے نفرت کیوں نہ کرتا۔ اگر محبت نفرت ہے تو گہرائی بھی ایک طرح کی الٹی بلندی ہے۔ اس کے تخیل میں وہ افق نہ تھے جن پہ بجلی کا کوندا لہراتا ہے، وہ اس تاریک افق تک نیچے پہنچ گیا تھا۔ جہاں کیچڑ کا لجلجا مادہ اکٹھا ہو جاتا ہے اور خیال میں کیڑے رینگنے لگتے ہیں، جیسے مثبت اور منفی ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، اسی طرح سٹ پر رمبھا اور زیدی ایک دوسرے سے الگ اور دور رہتے تھے۔

انسانی فطرت پانی کی طرح اپنی سطح ہموار رکھتی ہے۔ رمبھا نفرت نہ کر سکتی تھی، وہ تو افق پہ چاند کی کرن تھی، وہ پہ پھیلائے ڈولتی ڈولتی نیچے اتری، مسکرائی، لجائی، موم ہو گئی، وہ زیدی کے لئے اس قدر نرم بن گئی کہ زیدی اسے نگل بھی نہ سکا۔ خود پگھل بھی نہ سکا۔ رمبھا زیدی سے ہنس کر بات کرتی تو زیدی درشتی سے جواب دیتا، رمبھا اس سے چائے منگوانے کو کہتی تو وہ جان بوجھ کر چائے نہ منگاتا، رمبھا کہتی۔ "زیدی صاحب! آپ کے کپڑے میلے ہیں۔" زیدی دوسرے روز زیادہ میلے کپڑوں میں آتا۔ رمبھا کہتی "داڑھی بڑھائی ہوئی ہے، روز شیو کیا کیجئے، زیدی صاحب!" زیدی نے سچ مچ داڑھی بڑھا لی۔ مولانا ابوالکلام

کی سی داڑھی، چھدری چھدری لمبوتری داڑھی جو زیدی کے چہرے کو عجیب وجاہت بخشتی تھی۔ رمبھا کہتی "زیدی صاحب فلاں پکچر بہت اچھی ہے آیئے دیکھ آئیں" زیدی جواب دیئے بغیر کسی دوسری پکچر میں چلا جاتا درحالیکہ ایک گھنٹہ پہلے وہ خود اسی پکچر کو دیکھنے کا خواہش مند ہوتا، اور اپنے دوستوں کے ساتھ وہیں جارہا ہوتا تھا۔ اس کا جسم اور اس کی روح اپنی پوری قوت اور شدت سے رمبھا کے خلاف مدافعت کر رہے تھے۔ اس نے شاید سوچ رکھا تھا، میری بدصورتی روتی جائے گی لیکن ہار نہیں مانے گی، اس کی آنکھوں کی مجنونانہ چمک کہے دیتی تھی کہ مقابلہ بہت سخت ہے۔

رمبھا نے اپنا رنگ نہیں بدلا، یہ تو کہنا ٹھیک نہیں کہ اسے زیدی سے کوئی لگاؤ تھا، ہاں اتنی دلچسپی ضرور تھی کہ وہ اس کے عورت سے نفرت کے جذبے کو ضرور فتح کرنا چاہتی تھی۔ اور اس کے لیئے برابر کوشاں رہی۔ لیکن چونکہ خود بھی حسین تھی۔ اور حسن میں خود ایک ایسی تمکنت ہوتی ہے جو اتنی کاوش کی تاب نہیں لاسکتی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حسن خود چمکتا ہے۔ حسن اس قدر آبدار ہے کہ اسے چمکنا ہی چاہیئے اس کی فطرت سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے۔ زیدی ایک کاوش سے کم نہیں جیسے گیلی ہوئی لکڑیاں جن میں پھونک پھونک کر آگ روشن کی جاتی ہے، رمبھا ہر وقت چمکتی تھی۔ کاوش سے کم کام لیتی تھی کہ خود آگ تھی۔ سمجھتی تھی کہ ایک دن جلا بیٹھوں گی، اس لئے

مسکراتی تھی۔ قہقہے لگاتی تھی۔ نرم رو ہو جاتی تھی، جیسے روئی کا گالا، وہ آہستہ آہستہ زیدی کے دل پہ پھرتی تھی۔ جیسے مرغی انڈے پہ، اس کے حس کے نرم نرم پر زیدی کے . . . . . دماغ کی پتھریلی سطح کو چھوتے رہتے تھے اور یہ بالکل انجان سپنے میں گویا ہوتا تھا۔ اس قدر بھولے پن اور معصومیت سے کہ زیدی کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔

اب تک زیدی کی نفرت کی منزل بے حسی تھی، کم نگاہی، خود آگاہی اور لاپروائی۔ اب نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے کبھی کبھار رمیھا سے بات کرنا شروع کر دیا۔ "یہاں مت بیٹھئے،" یہ کرسی اچھی ہے۔ "وہ آدمی برا ہے،" "یہ پیالہ ٹوٹا ہوا ہے"۔ "یہ فقرہ غلط ہے،" "یہ زاویہ درست ہے،" چھوٹے چھوٹے سخنی سے فقرے، سخت، کرخت، رنجیدہ، تلے ہوئے انداز میں ایک جھٹکے سے بل کھاتے ہوئے۔ پتھر گلاب کی کلی کی طرف رجوع کر رہا تھا۔

پھر یہ نفرت اور بڑھی جب رمیھا نے ثنا نت سے محبت کرنی شروع کی۔ ثنا نت ہیرو تھا۔ رمیھا ہیروئن۔ محبت اتنی ہی لازمی ہے جیسے دو وقت کا کھانا۔ یا ساڑھی کے ساتھ بلاؤز پہننا۔ زیدی اس محبت کو قریب تر لا رہا تھا۔ وہ دونوں کو اکٹھے ہونے کا موقع دیتا۔ ثنا نت سے پہلے دونوں کو الگ لے جا کر ریہرسل کے بہانے الگ چھوڑ دیتا۔ چائے کی پیالیوں میں شراب لا کے دیتا، کہ سیٹ پر شراب پینا منع ہے، لیکن چائے پینا منع نہیں ہے۔ اس نے یہ دودھ کی کہکر

شراب منگائی جاتی، اور زیدی یہ سب دودھ کی چائے خود لاتا تھا اور
رمبھا اور شانت کی عامیانہ حرکتوں سے اپنے جذبۂ نفرت کو تقویت پہنچاتا
رہتا تھا۔ غالباً اس پہ یہ احساس غالب تھا کہ عورتیں کتنی جاہل
ہوتی ہیں۔ کیسے ریجھ جاتی ہیں۔ کس طرح شانت ایسے چغد سے پیار
کر سکتی ہیں کتنی جلد بے وفائی کا جامہ پہن لیتی ہیں۔ یہ عورتیں نفرت
کے قابل ہی تو ہیں۔ جوں، جوں زیدی کی نفرت بڑھتی گئی وہ اور بھی
رمبھا کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اب اس کی باتوں کی ناہمواری غائب
ہوتی گئی۔ اب وہ اس کے سامنے ہنس دیتا تھا۔ قہقہے لگاتا
تھا۔ پنچ اور السٹریٹڈ ویکلی کے لطیفے بیان کرتا تھا، اسے پڑھنے
کے لئے کتابیں دیتا تھا۔ رمبھا اس کے لئے سویٹر بن رہی تھی، پچھلے
دنوں جب اس کا خاوند آیا تو زیدی نے اسے اس طرح باتوں
میں الجھائے رکھا کہ شانت اور رمبھا کو اکیلے پھر جانے کا موقع بھی
ہاتھ لگ گیا۔ یہ عورت! زیدی دل میں ہنستا تھا۔ بدصورتی نے خوبصورتی
پر فتح پائی تھی۔

یہ نفرت یوں ہی چلتی رہی حتیٰ کہ پکچر کا آخری دن آگیا۔ زیدی
سٹ پر نہیں آیا، پکچر ختم ہو گئی۔ تالیاں، ہار، پھول، مٹھائی، جشن
و انبساط، پرسوں رمبھا واپس چلی جائے گی، اپنے خاوند کے
پاس، شانت پیشہ ور عاشقوں کی طرح رنجور، داڑھی بڑھائے،
بال پریشان کئے رمبھا کے سامنے آہیں بھرتا تھا اور وہ اسے

حسن کی تاثیر پہ مسکراتی تھی ۔ پھر اس نے کسی سے پوچھا "زیدی کہاں ہے؟" یوں ہی لاپروائی سے جیسے آدمی کسی بہت ہی ضروری بات کا ذکر کرتے کرتے اپنے کتے کو پچکارنے لگے ۔ زیدی کہاں ہے موتی کہاں ہے ۔ ڈبو کہاں ہے ، بیچارہ ، بدصورت ، مایوس ، مجبور بیمار کہاں ہے ۔ وہ اسے ڈھونڈتی پھری ۔ پروجیکشن روم میں، کیمرہ روم میں ، ساونڈ کے کمرہ میں ، دفتر میں ، خود اس کے کمرے میں ۔ وہ کہیں نہیں تھا ۔ آخر وہ میوزک روم میں گئی ۔

میوزک روم میں اندھیرا تھا ۔ تاریک اور بلند و بالا کھڑکی کی جھری میں سے اس نے جھانک کر دیکھا کہ زیدی پیانو پہ بیٹھا گا رہا ہے ۔

اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

اس کے گلے میں سوز ، پکار ، ترنم کچھ نہیں تھا ، مگر وزن ضرور تھا ۔ بھاری بوجھ جیسے گیت پتھر بن جائے اور چھاتی پہ بیٹھ جائے جیسے موت کا اندھیرا ، روشنی کی کرن کو مغلوب کرے اور کائنات کی طرف بڑھتا جائے ۔ جیسے نفرت کی چٹان پگھل پگھل کر محبت کے لاوے میں تبدیل ہو جائے ۔

زیدی گاتے گاتے پیانو پر سر رکھ کر رونے لگا ، بدصورتی کا ہیولہ کھل گیا تھا ۔ رمبھا باہر کھڑکی پہ کھڑی کھڑی رونے لگی ۔

وہ ایک دن اور ایک رات اسی سنگیت گھر میں محبوس

رہا۔ دراصل وہ محبوس نہیں تھا۔ اس نے کل کائنات کو باہر ڈھکیل کر اپنے آپ کو سنگیت گھر میں آزاد کر لیا تھا، دنیا اور اس کے دکھ اور اس کے غم اور اس کی سفلہ پروریاں اس سنگیت گھر کے باہر قید کر دی گئی تھیں۔ اور وہ ان سب سے آزاد اپنی روح کا نوحہ سن رہا تھا۔

اے غم دل کیا کروں۔ اے وحشت دل کیا کروں

رات بھر اور دن بھر وہ یہی دھن گاتا رہا، اور اس کی بدصورتی پگھلتی گئی، سنگیت گھر کے دروازے بند تھے اور لوگوں کے کھٹکھٹانے اور شور مچانے اور رمبھا کے چلانے پر بھی نہیں کھلے، اور جب رمبھا چلی گئی تو لوگ کھڑکی توڑ کر اندر گھس گئے۔ زیدی پیانو پر ادھ موا پڑا تھا۔ اس نے بلیڈ سے اپنی انگلیاں چھیل لی تھیں۔ اور پیانو کے سفید سروں میں اپنے خون کا رنگ بھرا تھا۔ اس نے اپنی بدصورتی کے نہاں خانے میں حسن کی محفل سجائی تھی، اور نفرت کی اندھی کوکھ میں محبت کے نرم جذبے کی تخلیق کی تھی، آج وہ حاملہ عورت کی طرح بیہوش پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اور اس کے گال اور اس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

کئی دنوں کے بعد زیدی کو رمبھا کا ایک خط ملا۔

" پیارے زیدی! تم نرے احمق ہو۔ میں نے تم سے دلچسپی ظاہر کی۔ تم نے جانے کیا سمجھا۔ یہ تمہاری غلطی تھی۔ میں ایک بیاہتا عورت

ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میں اپنے خاوند اور بچوں سے پیار کرتی ہوں
یہ احمقانہ خیال میرے دل میں کبھی نہیں آسکتا۔ یہ چاندی کا سگریٹ کیس
تمہیں بھیجتی ہوں۔"

زیدی نے خط پھاڑ کر جلا دیا اور چاندی کا سگریٹ کیس اٹھا کر
کنوئیں میں پھینک دیا۔ اور پھر ٹہلتے ٹہلتے میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

شہتوت کا درخت

جب بہار آئی تو شہتوت کے درخت پر کونپلیں پھوٹنے لگیں اور خشک سیاہ
ٹہنیاں اپنی سیاہی چھوڑ کر بھوری اور بھوری سے گلابی اور گلابی سے سبزی مائل، لچکتی
ہوئی ڈالیاں بنتی گئیں اور پھر ان ڈالیوں کی آنکھوں میں نازک کونپلیں اور ریشم سے
بھی ملائم پتیاں پھوٹنے لگیں۔

اور جب بہار گئی تو شہتوت کا درخت ان نوزائیدہ کونپلوں اور پتیوں سے
ہرا بھرا کھڑا تھا۔ کونپلوں کی لچکتی باہیں جیسے فضا میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور نئی
پتیوں کے ادھ کھلے نازک سے جسم ہوا کے لمس سے بھی شرما شرما جاتے تھے اور ان
کی سبز صراحیوں میں بارش کا رکا ہوا صاف شفاف سیمگوں پانی چمک رہا تھا اور ہوا
کے جھونکوں سے ڈھلک پڑتا تھا۔ جیسے کسی آہستہ خرام ساقی کی لغزش پا سے جام

یکایک چھلک جائے۔

اور جب گرمی کا موسم آیا اور بڑھا اور پھیلا۔ تو شہتوت کی ہر شاخ ڈال بن گئی۔ ادھ کھلے جھومروں نے آنکھیں کھولیں انگڑائی لی، بازو پھیلائے اور پھیل کر سبز سبز چکنے پتے بن گئے پہلے چکنے چکنے پھر کھردرے۔ پھر دندانے دار منقش پتے۔ حسین خمیدہ پتے قدرت نے اپنے برش سے بنائے تھے پتے جن کی نوک پلک کی ناز کی آج بھی ہر مصور کے لئے آئینہ حیرت ہے۔ اس کے فن کا سنہرا خواب ہے .... پھر پتے ہلے، ڈال جھومے، طوطے چہکے اور خزاں آئی۔

اور جب خزاں آئی تو بھنورے بھی آئے جھومروں کی نازک ڈنڈیوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اور ان کے بیچ میں شہتوت کھڑے تھے۔ سنہرے گلابی، قرمزی لمبے لمبے شہتوت آویزوں کی طرح جھلک رہے تھے چکدار یاقوتی شربتی توت بندوں کی طرح جھک جھک جاتے تھے اور جھومروں کے گچھے خوشی سے ناچتے معلوم ہوتے تھے اور فضا میں شہتوت کی دھیمی دھیمی نرم نرم گرم گرم خوشبو تھی اور بھونروں کا شریر نغمہ تھا۔ اور شریر لڑکوں کی پیہم دھومیں اور چڑیوں کی چیخیں اور ہرے ہرے طوطوں کی شوخ بولیاں اور ان کی زعفران رنگ چونچیں۔ اور پھر نیلے آسمان میں سفید بادلوں کے قریب قریب رنگا رنگ پرندوں کی وہ تیز اڑان، جیسے نگاہ میں ایک لمحے کے لئے دھنک کے سارے کے سارے رنگ یکایک ہنس پڑیں۔

اور جب خزاں جانے لگی تو شہتوت کہیں بھی نہ تھے۔ جھومر خشک ہو چلے تھے پتوں کا رنگ اڑ گیا تھا پہلے تو ان میں سفید زردی مائل چتلے داغ نمودار ہوئے۔ برص کی طرح اور پھر وہ پھیلتے گئے۔ حتیٰ کہ شہتوت کا ہر پتہ اپنا سبز لباس اتار کر

سردی میں ننگا ہو کر ٹھٹھرنے لگا۔ اب اس کے سپید ریشے اور ہڈیاں تک صاف نظر آتی تھیں۔ بیچ میں مردہ رگوں کی سفید جالی اور اس کے بیچ میں ڈنڈی کی نازک لکیر ریڑھ کی ہڈی کی طرح پتے کی گردن تک نظر آتی تھی۔ پھر طوفانی ہوا آئی کھڑکھڑاتے ہوئے سپید پتے بھی گر گئے۔ اب شہتوت کا درخت ٹنڈ منڈ کھڑا تھا بے برگ و بار اور اس کی سبز شاخیں گلابی اور گلابی سے بھوری اور بھوری سے سیاہی مائل ہوتی گئیں حتیٰ کہ خزاں چلی گئی۔ اور جاڑا آگیا۔ اور شہتوت کے درخت کی ہر ڈالی اور شاخ برف کے سپید گالوں سے لد گئی۔

۲

نواز نے شہتوت کے درخت کی طرف دیکھا اور ایک تھکا تھکا سکون آمیز سانس لیا اور پھر چھوری کا ہاتھ پکڑ کر اسے ناتراشیدہ پتھروں کے چبوترے کے پاس لے آیا۔ جو درخت کے چاروں طرف لگا ہوا تھا۔ رات کے سناٹے میں درخت یوں اکیلا کھڑا تھا۔ گویا کان لگائے خاموشی کے سینے سے نکلنے والے نغمے کا منتظر ہو۔ نواز اور چھوری بھی درخت کے قریب آکر رک گئے اور گویا سانس روک کر اسی نغمے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن رات کا سناٹا پھیلتا ہی گیا۔ چاروں طرف، گھاٹی پر جا بجا سا درخت کھڑا تھا۔ ڈھلوان پر جہاں برف کی روئیدگی نیچے نالے میں بہتے ہوئے پانی میں کھو جاتی تھی۔ نالے کے پار دیودار کے گھنے جنگل میں جس کا سینہ ان گنت اسرار لئے ہوئے بیچ بستہ تھا۔ اور پہاڑوں کی نیلگوں چوٹیوں تک یہ سناٹا پھیلا ہوا تھا اور آسمان کے مرکز میں چاند اکیلا چمک رہا تھا۔ گویا اس نیلی جھیل میں چپو چلاتے چلاتے

یکایک تھم گیا ہو اور اب ہانپتے ہوئے پتوار تھام کر نیچے اس جوان چھوری کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔

ہر جگہ سناٹا، ہر طرف سناٹا، ٹھہری ہوئی چاندنی کا سناٹا، کبھی نہ ٹھیرنے والی رات کا بے گونج سناٹا۔ اور نواز نے محسوس کیا کہ اس کے چاروں طرف اور اس کی نوجوان بیوی کے چاروں طرف کوئی آواز نہیں ہے۔ کوئی آفتاب نہیں ہے۔ کوئی رنگت نہیں ہے کوئی حرکت نہیں ہے، سناٹا اور چاندنی ہے۔ شہتوت کے درخت کی ڈالیوں پر برف کی ہر کور چاندنی کے لمس سے بلور کی طرح چمک رہی تھی۔ خود ان کے چہرے ماہتاب کے ٹکڑے تھے یا برف کے ٹکڑے تھے، یا خاموشی کے نغمے تھے اور چاروں طرف چاندنی تھی، چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی گداز چاندی، نالے کی کف آلود لہروں کے چمکتے ہوئے جھاگ کی چاندی، گہرے نیلے آسمان میں دہکتے ہوئے آفتاب کی چاندی اور نواز نے محسوس کیا کہ ان کی محبت کی پہلی رات کی کوئی چیز سونے کی نہیں ہے۔ ہر چیز چاندی کی ہے، سپید، براق، سیمگوں، حتیٰ کہ چھوری کی مخملیں شلوار اور قمیص پر بھی شوسی کے سپید پھول چمک رہے ہیں اور اس کی مسکراہٹ میں بھی چاندی گھلی ہوئی ہے اور اس کے کانوں میں بھی وہی سپید بندے چمک رہے ہیں، جن سے چھوری کے چہرے کا بیضوی حسن اور بھی دمک گیا۔

نواز نے پھر ایک تھکا تھکا سکون آمیز سانس لیا اور چھوری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تنے کے قریب لے آیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور بے حد خوش تھا۔ وہ آج چھوری کو بیاہ کر لایا تھا۔ چھوری نگر گاؤں کی لڑکی جو نواز کے گاؤں سے آٹھ کوس دور تھا۔ اور بڑی مشکل کے راستے میں پڑتا تھا۔ آج نواز اور چھوری کا بیاہ تھا۔

لیکن نہ کہیں شہنائی بجی تھی، نہ کہیں سے برات آئی تھی۔ نہ کسی نے عروسی گیت گائے تھے۔ کیونکہ نواز کا باپ موچی تھا۔ اور بے حد غریب تھا۔ اور پھر چاروں طرف برف پڑی تھی اور تحصیل جانے کے تمام راستے بند پڑے تھے، اس لئے نہ شہنائی، نہ برات، نہ دعوت اور پھر اگر برف نہ ہوتی تو غریبی ہوتی۔ جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی اور پالے کی ماری ہوئی تھی۔ اس لئے شادی اس طرح خاموشی میں طے ہوئی تھی۔ اور نواز گھر سے دلہن کو لانے کے لئے اکیلا اسطرح روانہ ہوا تھا۔ گویا شادی نہیں فصل کا سامان بہم پہنچانے جا رہا ہو۔ صبح کو وہ گھر سے نکلا اور دوپہر کو نگر گاؤں میں پہنچ گیا۔ قاضی نے نکاح پڑھایا۔ بیاہ پر نواز کے صرف سترہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ چاندی کی بالیاں سنار نے ادھار دی تھیں۔ دلہن کی جوتی اس نے خود بنائی تھی اور سوسی کی شلوار اور قمیص اور سرخ دوپٹا اور چٹیا میں گوندھنے کے لئے کانچ کی گھریاں اور ایک چاندی کا چھلا اس نے آٹھ جوتے فروخت کرکے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا۔ ایک جوتا تحصیلدار کے لئے بنایا تھا۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دوسرے جوتے کے اسے سوا پانچ روپے ملے تھے۔ نمبردار نے لیا تھا۔ تیسرا جوتا پیرجی کی بیوی کا تھا پیرجی تو کچھ نہ دیتے۔ لیکن ان کی بیوی نے نواز پر رحم کھا کر اور اس کی شادی کا ذکر سن کے اُسے ساڑھے تین روپیہ بخشش دیئے تھے۔ چوتھا جوتا اس کے اپنے گاؤں کے کسان محمدو کا تھا۔ محمدو ایسا جوتا چاہتا تھا جو کم از کم تین سال تک دو گز گہری برف میں چل کر بھی خراب نہ ہو جس کی کیلوں کی آواز رات کے سناٹے میں پگڈنڈی پر میلوں تک سنائی دے۔ اور جو وزن میں اتنا بھاری ہو کر لڑائی کے وقت پٹواری کے سر کے دو ٹکڑے کر سکے محمدو نے خوش ہو کے اسے پورے آٹھ روپے دیئے تھے۔ جو

نے کہا جوتا تو پانچ روپے سے زیادہ کا نہیں ہے۔ لیکن بیٹا تیرا ذکاح ہے اور اس وقت میں تجھے اتنے ہی پیسے دے سکتا ہوں۔ یہ ہے پونے آٹھ روپے۔ پانچواں جوتا خواجہ غلام حسین گرداور کا تھا۔ کل دو روپے ملے تھے۔ چھٹا جوتا بھنتیا براہمن کی بیوی کا تھا۔ جو وہی جوتا پہن کر گاؤں سے بھاگ گئی تھی۔ اور بھنتیا براہمن اسے گالی دیتا تھا کہ نہ نواز جوتا بناتا نہ اس کی بیوی بھاگتی اور کمبخت وہ عورت بھی تو گویا بھاگنے کے لئے جوتے کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنی محنت سے اس نے جوتا بنایا تھا۔ الٹی کھال کا سنہرے چمڑے کا جوتا جس پر چاندی کے تاروں سے پھول بنائے گئے تھے۔ نو روپے ملے تھے۔ اس کا ساتواں جوتا چودھری رحمت علی کا تھا جو کشمیر اسمبلی میں اس کے علاقے کا نمائندہ تھا بچھڑے کی کھال کو کما کے کاغذ کی طرح نازک بنا کے ناؤ کی طرح ہلکا پھلکا جوتا اس نے بنایا تھا۔ لیکن غریبوں کے نمائندے نے صرف ڈھائی روپے دیئے تھے۔ اور کہا تھا۔ باقی اگلی فصل پر لے لینا۔ آٹھواں جوتا اس کی بیوی کا تھا جو وہ خود پہنے تھی۔ کتنی محنت سے اس نے یہ جوتے بنائے تھے اور جیب جا کے وہ سوسی کی شلوار اور قمیص اور سرخ دوپٹا اور کانچ کی چوڑیاں خرید سکا تھا۔ وہ آہستہ سے ہنسنے لگا۔

چھوری نے پوچھا۔ کیوں ہنس رہے ہو؟

نواز نے اس کی قمیص کو چھوا اور کہا۔ یہ قمیص بہت اچھی ہے۔ پھر اس نے اسکی شلوار کو چھوا اور کہا۔ یہ بھی بہت اچھی ہے۔ پھر اس کی چٹیا کو زور سے ہلا کر چھوڑ دیا اور ایک دم کانچ کی چوڑیاں ایک ساتھ بج اٹھیں۔ اور ان کا نرم سریلا لوچ منجمد فضا میں کانپتا کانپتا دور کہیں غائب ہو گیا۔ نواز ہنسا اور اس نے کانچ کی چوڑیوں

کو پھر بجایا۔

چھوری نے پوچھا۔ کیوں ہنس رہے ہو۔

نواز نے کہا یہ بھی بہت اچھی ہیں۔ اور چھوری نے مغرور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "تم تو پاگل ہو"۔ اور نواز پھر ہنسا۔ وہ کھلونے کی ان چیزوں سے کھیل رہا تھا یہ اس کے دل کے کھلونے تھے۔ اس کے لہو سے بنے تھے۔ اس کی رگوں کی ساری قوت سوی کے پھولوں میں کانچ کی شرلیوں میں اور دوپٹے کی سرخی میں کھنچ آئی تھی۔ پھر وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ اتنی اچھی رات تھی اتنی اچھی چھوری تھی۔ اتنی خاموشی تھی۔ شہتوت کے درخت پر پتے آئے تھے۔ جب ایک سال پہلے اس وقت اس نے چھوری کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اور اب وہ اس کی بیوی بنی۔ برقعہ بار ڈالیوں کی اوٹ میں اس کے پاس کھڑی تھی۔ پھر وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ اس کی زندگی کی صبح کے سنہرے خواب محبت کی وادی میں حقیقت بن گئے تھے۔ اور پھر وہ اتنا پڑھا لکھا بھی نہ تھا کہ محبت کو جھٹلا سکتا۔ اس کی تضحیک کر سکتا۔ اسے فلسفے کے زہراب سے مسموم کر سکتا۔ وہ ایک معمولی گنوار، ان پڑھ، جفاکش موچی تھا۔ اور اپنی جوانی کی امنگوں اور اپنی محبت کی التجاؤں کو لئے ہوئے اپنے محبوب کے حضور میں کھڑا تھا۔ نواز وہ بد نصیب نہ تھا جس نے کبھی محبت نہیں کی۔ اس کی خوشی، اس کے غم کا مزہ نہیں چکھا۔ اس مختصر لمحے کی دوامی کیفیت سے آشنائی حاصل نہیں کی۔ جب کھوئی ہوئی جنت واپس مل جاتی ہے اور فضا میں کلیاں سی کھلنے لگتی ہیں اور گلاب کے پھول ہنسنے لگتے ہیں اور آشیانوں میں طیور ناچنے لگتے ہیں۔ یہ لمحہ بہت ہلکا ہے، بہت سنہرا ہے بہت مختصر ہے، لیکن اس کا مزہ باقی رہتا ہے۔ اس وقت بھی جب زندگی جوان نہیں رہتی

اس وقت بھی جب دھوپ ڈھل جاتی اور شام آجاتی ہے۔ اس وقت بھی شام کے بڑھتے ہوئے سایوں اور رات کے تاریک آنچل میں محبت کی خوشبو باقی رہتی ہے اور آج نواز کی محبت کی پہلی رات تھی۔ لیکن کس قدر پھیلی ہوئی خاموش چپ چاپ رات تھی۔ شاید ہر محبت کی رات ایسی ہوتی ہے۔

دن میں آدمی اپنی مسرتوں اور غم میں گھٹتا ہے۔ لیکن جب رات آتی ہے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ رات جس کی خاموشی اور جس کے اسرار کی کوئی تاریخ نہیں۔ رات جب سب سو جاتے ہیں اور محبت جاگتی ہے ہزاروں سالوں سے ہزاروں آسمانوں کے نیچے رات آدمی کے لیۓ محبت کا تحفہ لاتی ہے۔

چھوری کا جسم نواز کے لمس سے کانپ گیا۔ جیسے وہ چھریرا کنوارا جسم اپنے خوابیدہ احساسات لیۓ اس کے جگانے والے ہاتھوں کا منتظر تھا۔ وہ کانپی اور بے اختیار اس کی طرف کھنچتی چلی گئی کوئی اسے ڈھکیل رہا تھا۔ اس کا سانس غائب کر رہا تھا۔ اس کے بند بند ڈھیلے کیۓ دیتا تھا۔ اور جب چھوری نے اپنے ہونٹوں پر نواز کے سانس کی آنچ اور اس کے لبوں کی سردی کو محسوس کیا وہ پھر کانپی چاروں طرف برف تھی۔ اور وہ اسے چوم رہا تھا۔ وہ پہلا بوسہ، ٹھنڈا یخ بستہ برفاب بوسہ، باہر سے برف اندر سے شعلہ بوسہ، جوانی کا حسین مقدس ترین بوسہ، اور نواز نے بھی محسوس کیا کہ چھوری کا لمس نرم ہے، سرد ہے اور لطیف ہے اس سے اس کے جسم کا بخار کم ہو گیا وہ نرم اور سرد جسم جیسے گلاب کی پتی برف میں دھوئی گئی ہو جیسے برف کے ٹکڑے کو سورج کی کرن نے چھو لیا ہو۔ نواز ہنسا۔

چھوری نے پوچھا "کیا ہے؟"

نواز نے پوچھا۔ "وہ کھیت یاد ہے۔ جہاں گیہوں کی بالیاں تھیں؟"

چھوری نے کہا "اور تم نے فناتو کھلائے تھے"

وہ کھیت ننگ گاؤں کے باہر تھا۔ اس راستہ پر جو تحصیل کو جاتا ہے۔ اس روز نواز تھانہ دار صاحب کے لیئے جوتا لے جا رہا تھا تو اس کی نظر بٹیروں کی ایک ڈار پر پڑی جو قریب ہی کی جھاڑی سے نکل کے بھاگا۔ اور گیہوں کے کھیت میں جا کے بیٹھ گیا۔ راستہ نیچے کو جا رہا تھا۔ اور گیہوں کی بالیاں دہوپ میں سونا بکھیر رہی تھیں۔ کوئی نواز کے دل کے اندر ناچنے لگا۔ یہ شاید بہار تھی۔ یا جوانی تھی یا بے فکری تھی یا فضا کی گرمی تھی۔ نواز کا جی چاہا کہ وہ ڈار میں سے دو ایک بٹیر پکڑ لے۔ اس نے جوتے کو بغل میں دابا اور ہولے ہولے قدموں سے کھیت میں داخل ہو گیا۔ جیسے سپاہی خندق پار کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ پیٹ زمین سے لگائے چل رہا تھا سر سر گیہوں کی بالیاں اس کے کانوں سے چھو جاتیں۔ اور پھر جل کر فضا میں جھومنے لگتیں۔ بٹیروں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اب وہ بہت ہی دبکے پاؤں، آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک قدم اور، سامنے فناتو کی سبز جھاڑی پر بٹیر فناتو ٹھونگ رہے تھے۔ نواز نے بڑھ کے اپنی چادر پھینکی اور عین اسی لمحے دوسری طرف سے ایک سرخ چادر فضا میں لہرائی اور بٹیر ان میں گھر گئے۔ نواز نے فناتوؤں کی بیل کی اوٹ سے دیکھا کہ دو نشر یا آنکھیں جھانک رہی ہیں نواز اور آگے بڑھا چھوری بیل کی دوسری طرف اپنی سرخ چادر کا کونا پکڑے دبکی بیٹھی تھی۔ اور نواز کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی اور نواز اسکی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا چند لمحے وہ دونوں ایکدوسرے کیطرف چپ چاپ دیکھتے رہے۔ پھر دونوں کے ہاتھ ایکدم چادر کو چھوڑ کر مقید بٹیروں کیطرف بڑھے۔

"یہ بٹیر میرے ہیں"۔ چھوری نے کہا۔

"نہیں میرے ہیں"

"تم کون ہو۔ ہمارے گاؤں کے تو نہیں ہو؟"

"بٹیروں کا کوئی گاؤں نہیں ہوتا۔ وہ تو پار سے آتے ہیں۔ اور جب گیہوں کی فصل کٹ جائیگی تو اڑ کر پھر پار چلے جائیں گے"

"بٹیر چھوڑ دو" چھوری نے کہا۔

"کیوں؟" نواز نے پوچھا۔

چھوری اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُسے نواز بہت اچھا لگا۔ سنہرا رنگ، کھلی پیشانی، مضبوط کلے۔ تیکھی ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ اور چھدری چھدری داڑھی۔ اپنی پسند سے وہ خود ہی شرماسی گئی۔ اس کی رنگت عنابی ہو گئی۔ چھوری نے آنکھیں جھکا لیں۔ تو نواز نے کہا "تم کون ہو؟"

"میں چھوری ہوں۔ دینے موچی کی لڑکی"

"ہوں" نواز چہکا "تو گویا اپنی برادری کی ہو۔ میں بھی موچی ہوں۔ نواز نے کہا۔ میرا نام نواز ہے چھوٹے گاؤں میں رہتا ہوں"

"شاہ جی کے بیٹے ہو؟" چھوری نے پوچھا "ابا انھیں جانتے ہیں"

"واہ" نواز نے بڑھ کے چدر کے اندر پھڑکتے بٹیروں کو پکڑنا چاہا کہ اسی لمحے چھوری کا ہاتھ بھی اسیں پہنچ گیا۔ نسائی ہاتھ، مگر چپا تلا مضبوط ہاتھ مگر بے خبا۔ نواز نے سمجھوتہ کرتے ہوئے کہا۔ اچھا تو تم اپنی چدر ہٹالو۔ ہم بٹیر تمہیں ویسے دیتے ہیں ۔۔

چھوری نے اپنی چدر سنبھال لی۔ نواز نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی چدر میں

سے بٹیر ڈھونڈنا شروع کئے اور اس کے چہرے کی مایوسی بڑھتی گئی۔ آخر رکتے ہوئے لہجے میں بولا "ایک ہی تو ہے"۔ اور وہ اسے چدّر سے باہر نکال لایا۔

بٹیر پھڑپھڑا رہا تھا۔ نواز کی مٹھی میں، باہر نکلا پڑتا تھا۔

"ہاں ایک ہی تو ہے" چھوری نے کہا۔

"لو" نواز نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

چھوری نے اس کی چونچ اپنے ہونٹوں سے لگائی۔ اس سے پیار کیا۔ اور پھر نواز کو واپس دیتے ہوئے کہا "اسے تم لے لو"

نواز نے بٹیر کی چونچ اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ اور چھوری نے سرخ چدّر میں اپنا منہ چھپا لیا اور بے تحاشا ہنسنے لگی۔ نواز نے کہا۔ "اسے چھوڑ دیں"

"ہاں" چھوری نے کمزور آواز میں کہا۔

بٹیر اڑ گیا۔ تیر کی طرح ادہر ادہر۔ وہ دونوں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اپنی آرزوؤں کو اڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ پھر بٹیر نے پر سمیٹ لئے اور فضا میں ایک ڈبکی لگائی۔ اور دور راخ کے بڑے جھاڑ میں غائب ہو گیا۔

چھوری اور نواز ایک دوسرے کے آمنے سامنے لیٹے ہوئے تھے۔ اور فنانو کی بیل بیچ میں تھی۔ فنانو کی تیز اشتہا انگیز خوشبو نے انھیں جلد اپنی طرف راغب کر لیا۔ اور وہ پکے پکے زرد زرد فنانو توڑ توڑ کر ایک دوسرے کو پیش کرنے لگے۔

اب اس وقت بھی پورے ایک سال بعد وہ پہلی ملاقات کی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ بٹیر چاند کے قریب کہیں اڑ رہا تھا۔ اور پھیلی ہوئی برف کے سینے سے گندم کی سنہری بالیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور فضا میں دوپہر کی

گرمی تھی اور بہار کا نغمہ تھا۔ جس کی گونج چھوری اور نواز کے دلوں سے ٹکرا رہی تھی۔
نواز ہنسا۔ پھر چھوری ہنسی اور نواز نے پوچھا "کیوں ہنسیں"
چھوری نے کہا "یاد ہے جب تمہیں ابا نے پیٹا تھا"
چھوری کے ابا نے نہیں۔ نواز کے ابا نے اس کے بڈھے ابا نے اپنے جوان بیٹے کو بری طرح پیٹا تھا۔ کیونکہ میلے پر چھوری کھوٹ کی ہنسلی پہننا چاہتی تھی۔ بالکل ایسی ہنسلی جو نمبردار کی بھینس کے گلے میں تھی۔ اسی طرح کی چوڑی چوڑی ٹکلیوں والی گول گول ہنسلی، اور سنار اس کے پندرہ روپے مانگتا تھا۔ اور نواز نے کہا تھا۔ کہ وہ چھوری کو ضرور وہ ہنسلی لا کے دے گا۔ لیکن بے چارہ کہاں سے لا کے دیتا۔ پندرہ روپے تو کیا۔ اس کے پاس پندرہ پیسے بھی نہ ہوتے تھے۔ آخر جب کوئی داؤ نہ چلا۔ اور میلے میں صرف چار روز رہ گئے۔ تو نواز نے ایک کسان کا جوتا اٹھا کے کسی دوسرے کسان کو دے دیا۔ اور اس سے روپے لے کے خوبانی کے پیڑ کے نیچے گاڑ دیئے۔ اس کے ابا نے اسے بہت پیٹا۔ اور اس سے بار بار پوچھا۔ بتا روپے کہاں رکھے ہیں لیکن نواز نے نہ بتانا تھا۔ نہ بتایا۔ پھر اس نے میلے کے دور وز پہلے نئی بکری کھال جو اس کا ابا تازی خرید کے لایا تھا تحصیل میں لے جا کے فروخت کر دی ابا کو اس بات کا بھی پتا چل گیا۔ پھر تو اس نے نواز کی وہ مرمت کی ہے وہ مرمت کی ہے کہ نواز بھی بڑا ڈھیٹ نکلا۔ اس نے اپنے پندرہ روپوں کا خزانہ اپنے ہی پاس رکھا۔ اور میلے کے روز کھوٹ کی ہنسلی خرید کے چھوری کو دے دی۔ اس روز وہ کتنا خوش تھا وہ ہنس نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا جبڑا مار کے سوجا ہوا تھا۔ پھر بھی اپنی آنکھوں سے وہ ہنس رہا تھا۔ اپنے دل سے وہ ہنس رہا تھا۔ اپنے نتھنوں

سے وہ ہنس رہا تھا۔ اور جب چھوری نے وہ ہنسلی پہنی تو اس کی آنکھوں میں اسوقت ایک ایسی چمک آگئی۔ گویا اس نے اپنی چھوری کے لئے ہنسلی نہیں، روضہ تاج محل تعمیر کردیا تھا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ محبت کی آنکھ اندھی ہوتی ہے۔ جبھی تو وہ کھوٹ کی ہنسلی اور مرمر کے مقبرے میں کوئی فرق نہیں دیکھتی۔ . . . . چھوری نے تشکر آمیز نگاہوں سے نواز کی طرف دیکھ کے اور اپنے گلے میں پڑی ہوئی ہنسلی کو چھوکے کہا: "بڑی بڑی ہے یہ"۔

نواز نے مسکرا کر اپنے جبڑے کو ہلایا اور پھر گھوم کر پرے اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ جو شہتوت کے درخت سے پرے ایک سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس کا ابا اور اس کی اماں سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر گئی تھی اور اب ان کا بیٹا اپنی دلہن کو لے کے واپس گھر آرہا تھا۔ تین کوس تو وہ اور چھوری برف میں چلے آئے تھے۔ کیونکہ چھوری زمین کی ان کروڑ بیٹیوں میں تھی جن کے پاؤں کبھی ڈولی میں نہیں پڑتے۔ کبھی جھولے میں نہیں جھولتے۔ کبھی گاڑی ہی نہیں چڑھتے۔ وہ زمین کے سینے پہ چلتے جاتے ہیں حتیٰ کہ بچپن گزر جاتا ہے حتیٰ کہ سہرا کہیں گزر جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جوانی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بڑھاپا گزر جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موت آجاتی ہے۔ اور وہ تھکے تھکے قدم قبر کی گہری غار میں اتار دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہولے ہولے چلتے ہوئے مایوس اداس قدم جو اپنی محنت سے سونا اگلتے ہیں۔ وہ کھیت بوتے ہیں، جو تے بناتے ہیں اور کائنات کی بسیط برفیلی فضا میں بہار کا پیغام لاتے ہیں۔ کیا سچ مچ انہیں کبھی ڈولی نہ ملے گی۔ کبھی جھولا نہ ملے گا۔ کبھی حنا کی لکیر میسر نہ ہوگی۔ مندروں سے لیکر مسجدوں تک یوں ہی گزر جانے والے قدم کیا ہمیشہ یونہی چلتے رہیں گے، بے سواری بے آسرا۔

پہلے تین کوس تو چھوری نواز کے ساتھ ساتھ پیدل برف میں چلی آئی تھی۔ چاندنی رات تھی اور راستہ اونچائی کی طرف جاتا تھا۔ اور برف کہرے سے پتھر کی طرح سخت ہو چکی تھی۔ اور نواز کے مضبوط ہاتھ اس کی مدد کے لئے ساتھ ساتھ تھے۔ اس لئے وہ تین کوس پیدل اس گہری برف میں چلی آئی تھی۔ لیکن تین کوس کے بعد اس کے قدم دھیمے پڑ گئے تھے۔ اور وہ رک رک کر پیچھے رہ جاتی تھی۔ آخر اس کے پاؤں شل ہونا شروع ہوئے اور پاؤں سے لہو پھوٹنے لگا۔ اور وہ کہرے والی برف کی اینٹھن سے بے تاب ہو کر آگے بڑھنے سے معذور ہو گئی۔ تو نواز نے ہنس کر اسے اپنے کاندھے پر بٹھالیا۔ اور باقی راستہ ان دونوں نے اسی طرح طے کیا۔ ہیر کو ڈولی مل گئی تھی۔

نواز نے پھر ایک نگاہ اپنے گھر کی طرف ڈالی اور کہا "چلو اب گھر چلیں۔ آؤ تمہیں اٹھالوں۔"

"نہیں۔ وہاں تک تو پیدل چل سکوں گی۔"

نواز نے اُسے اپنی گردن پر سوار کرلیا اور آگے بڑھا۔ کچا گھر برف سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ نواز داخل ہوا۔ تو چاروں طرف اندھیرا دیکھا۔ آنگن میں کوئی نہ تھا۔ اور آنگن کے اندر گھر جو صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا اندر سے بند تھا۔ اسکے ابا اور اماں یہ سوچ کر سو گئے تھے کہ اب بیٹا کل ہی آئے گا اور انہیں واقعی اس کی امید بھی نہ تھی۔ کہ نواز اس برفیلی رات میں آٹھ کوس چل کے آدھی رات کے وقت گھر پہنچے گا۔ اندر سے خراٹوں کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ چھوری نے اپنے نئے گھر کی طرف دیکھا۔ یہ گھر اس کے اپنے گھر سے مختلف نہ تھا۔ بالکل ایسا ہی گھر ایک آنگن اور

ایک کمرہ اس نے ہر گھر میں دیکھا تھا۔ ماسوا نمبردار کے گھر کے، ہر کسان کا گھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اسی میں اس کے بال بچے رہتے تھے۔ اسی میں وہ رہتا تھا۔ اسی میں اس کے بیل رہتے تھے، بھیڑ بکریاں، ہزاروں سالوں سے وہ اسی طرح رہتا چلا آرہا تھا۔ چھوری کے نتھنے فضا سونگھنے لگے۔ وہی بوٹی جانی پہچانی گوبر پیشاب اور سڑے ہوئے چمڑے کی سہانی خوشبو۔ وہ اپنے ہی گھر میں تھی۔

نواز نے اسے آہستہ سے نیچے اتارا۔ پھر خراٹوں کی آواز سنی۔ دیر تک وہ چپ آنگن کی تھم کا سہارا لئے ایک دوسرے کے قریب کھڑے رہے۔ پھر نواز نے آہستہ سے کہا۔ اب ان کو نہیں جگائیں گے۔ اتنا کہہ کے وہ آنگن میں مڑا اور ایک کونے سے کمائی ہوئی کھال کا بڑا سا ٹکڑا اٹھا لایا اس ٹکڑے کو اس نے وہاں بچھا دیا۔ جہاں ایک طرف جوتے بنانے کے اوزار پڑے تھے۔ ینٹی، ہتھی، ہتھوڑا، کھٹا، رندہ، گھٹی ملے جلے پڑے تھے۔ اور دوسری طرف ایک بھیڑ اپنے بچے کو آغوش میں لئے سو رہی تھی۔ کھال پر ایک پرانا اونی کمبل ڈال کے اس نے اپنے جوتے کھول کے الگ رکھ دیئے اور پھر چھوری کو آواز دی۔ آہستہ سے۔

"چھوری"

کئی لمحے گذر گئے چھوری چپ چاپ تھم سے لگی کھڑی رہی پھر وہ آہستہ سے مڑی۔ اس نے اپنے جوتے اتارے اپنے پاؤں پونچھے۔ اور کھال پر آکے لیٹ گئی۔ اس کا ہاتھ بھیڑ کے بچے کی نرم نرم اون سے کھیلتا رہا۔ پھر جیسے اندر ہی اندر اس کے دل کی برف پگھل گئی اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اور نواز نے اپنی آغوش میں لیکر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"کیا ہے چھوری"

"اماں یاد آتی ہیں" چھوری نے روتے روتے کہا۔

تیسرے پہر جب نواز کی اماں کی آنکھ کھلی تو اس نے باہر آکے دیکھا کہ آنگن میں چھتے ہوئے حصے کے نیچے تھم کے پاس اس کا بیٹا اور اس کی بہو دونوں معصوم بچوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے ہوئے سو رہے ہیں۔ کمبل جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور نواز کا ہاتھ چھوری کی گردن میں تھا۔ اور چھوری کے آنسو نواز کے رخساروں پر خشک ہو گئے تھے۔ اور انکے ایک طرف جوتے بنانے کے اوزار تھے اور دوسری طرف ایک بھیڑ اپنے بچے کو لئے سوتی تھی۔ اور سامنے برف پڑی تھی اور اوپر چاند تھا۔ اور نیچے کھال کا ٹکڑا تھا اور چاروں طرف ایک گہری معصومیت تھی۔ ایک بے پایاں تقدیس تھی۔ اور اگر کہیں کوئی خدا تھا تو آج وہ یہاں موجود تھا۔ اور اگر کہیں کوئی سچائی تھی، کہیں کوئی نیکی تھی تو وہ آج یہاں موجود تھی۔ نواز کی اماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان دونوں معصوم بچوں کو اپنی گود میں اٹھا لے اور انہیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلائے اس کا رُواں رُواں ممتا سے سرشار ہو گیا۔ اور اس نے اپنے چاروں طرف اس طرح مغرور نگاہوں سے دیکھا گویا اپنے سامنے ہزاروں دشمنوں کو سرنگوں دیکھ کے کہہ رہی ہو۔ دیکھ لو جی بھر کے دیکھ لو۔ یہ ہیں ہماری زمین کے دو خوبصورت پھول کیچڑ اور برف اور غریبی اور بے کراں درد کے باوجود کس نے اتنی خوبصورتی اتنی معصومیت اتنی نیکی کسی تخلیق میں دیکھی ہے؟۔

ماھر فن

جب ہندوستان میں انگریزوں کا راج تھا، ان دنوں مغرب سے بڑے بڑے ماہر فن آئے ۔ انھوں نے ہل چلانے کے نئے طریقے ایجاد کئے گو ہل وہی پرانے رکھے لیکن کھاد بنانے اور اسے کھیتوں میں ڈالنے کی ایسی نئی ترکیبیں نکالیں کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں فصل مغلیہ سلطنت کے وقت سے آدھی رہ گئی ۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی توجہ حکومت کے نظام کی طرف منعطف کی ۔ کیونکہ ہندستان میں نراج کا عالم تھا ، ہر گاؤں میں اپنی پنچایت تھی ، اور حکومت اور انصاف کا کہیں مرکز نہ تھا پنچایتوں میں من مانی کاروائیاں ہوتی تھیں اور انصاف کے پردے میں ظلم روا رکھا جاتا تھا ۔ ایک ماہر فن نے جس کا نام میکالے تھا اس سلسلے کو یہ یک

جنبش قلم دور کیا اور پنچایتی انصاف کو مٹا کے اک ایسے سلسلۂ قوانین کی داغ بیل ڈالی کہ جس کی رو سے دنیا کا ہر کام جرم بن گیا۔ یعنی آپ کوئی کام کیجیۓ یا نہ کیجیۓ، آپ ہر وقت اس نئے سلسلے کی تعزیر کی زد میں رہتے ہیں۔ اس سلسلۂ قوانین کی شرح کے لئے وکلا مقرر کیۓ گئے جنھوں نے اس نئے قانون کی تشریحات اور توضیحات کے سلسلے میں اتنی مبسوط اور مفصّل کتابیں لکھیں کہ اگر ان کتابوں کو جلایا جائے تو تو اس سے اتنی بھاپ پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک بحری جہاز دنیا کے گرد پچاس بار چکر لگا سکتا ہے۔ یا اگر ان کتابوں کے حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کے جوڑا جائے تو زمین اور چاند کے درمیان ایک نئی سڑک تیار ہو سکتی ہے، ان کتابوں کا مجموعی حجم اس قدر بڑا ہے کہ اس سے بحر اطلانٹک میں دو ہزار مربع میل کا ایک نیا جزیرہ تیار ہو سکتا ہے۔ جس میں دو کروڑ چینی یا دو لاکھ ہندوستانی یا دو سو انگریز بآسانی بود و باش کر سکتے ہیں! ایک ماہر فن کی عظمت کا اندازہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

انصاف کے طور طریقے بدلنے کے بعد ایک دوسرے ماہر فن نے مالگزاری سسٹم کی طرف توجہ فرمائی۔ اس سے پہلے لگان کا طریقہ بالکل سیدھا سادہ تھا، یعنی کسان اپنی زمینوں کے مالک تھے اور راجہ کو ہر فصل کے موقعے پر اپنی فصل کا ایک حصہ بطور لگان عطا کرتے تھے۔ اگر فصل کم ہوتی تھی تو یہ حصہ کم ہو جاتا، فصل زیادہ ہوتی تو راجہ

کو بھی لگان زیادہ ملتا۔ ماہر فن نے اس جاہلانہ طریقے کو بھی خیرباد کہا اور ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جس سے کسان نہ اپنی زمینوں کے مالک رہے نہ اپنی فصل پر ان کا کوئی اختیار رہا۔ اور یہ سب کچھ مالگزاری کے بندوبست کے تحت ہوا۔ اور اس خوبی سے ہوا کہ پٹواری، نمبردار ذیلدار، اور زمیندار اور سرکار کو فصل کو حصّے بخرے دینے کے بعد کسان کے پاس دو روز کا کھانا بھی نہ بچتا تھا۔ اس حسین طریقۂ مالگزاری سے تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے کسان دنیا کے امیر ترین کسانوں میں شمار ہونے لگے۔

اگلے زمانے میں سکوں کا رواج زیادہ نہ تھا۔ چیزیں کوڑیوں کے مول بکتی تھیں اور بافراط ملتی تھیں۔ ہر ہندوستانی کو اس کی بنیادی ضروریات کے لئے ایک گھر، کپڑا، کھانا، بیوی اور موت مل جاتی تھی۔ لیکن ایک ماہرفن نے اس میں بھی ایک نئی طرح ایجاد کی، اور کاغذ کا سکہ چلایا۔ جوں جوں یہ سکہ چلتا گیا، لوگوں کے پاس دولت بڑھتی گئی۔ بنیادی ضروریات بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ سو سال کے بعد ایک اوسط ہندوستانی کے سر پر نہ چھت رہی، نہ بدن پر کپڑا رہا، نہ پیٹ میں روٹی رہی۔ روپیہ بینکوں میں لاکھوں، کروڑوں بلکہ اربوں جمع تھا لیکن بازار میں ڈیڑھ پاؤ گیہوں یا دو گز کپڑا بھی دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ بیویاں صرف بلیک مارکیٹ میں دستیاب ہوتی تھیں، اور موت کے لئے کفن بھی ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ ہندوستان میں کاغذ کے سکے آنے

سے پہلے سونے کا سکہ رائج تھا، پھر چاندی کا سکہ رائج ہوا، پھر آدھی چاندی اور آدھے نکل کا سکہ اور آخر میں تانبے کا سکہ بھی باقی نہ رہا۔ کاغذ ہی کاغذ رہے ہے۔ ایک روز کاغذ بھی نہ رہیں گے، اور صرف اللہ کا نام باقی رہ جائے گا۔ کہ اللہ سے بڑھکر دنیا میں اور کوئی بینکر نہیں!

ہندوستانی بڑے جنگلی، وحشی، بربری قوم تھے، ہر گاؤں میں ایک مکتب تھا، جہاں یہ لوگ ایشیا کی نیٹو زبانیں سیکھتے تھے چنانچہ اس زمانے میں ہر گاؤں میں سنسکرت یا عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور نوٹنکی اور راس لیلا کے بیہودہ تماشے ہوا کرتے تھے۔ اور عورتیں چکی پیستے وقت اپنے من گھڑت ناکارہ لوک گیت گاتی تھیں۔ یہ تھا اس زمانے کا نکما کلچر۔ ماہرفن جہاں ریل گاڑی، ڈاک اور سڑکیں لائے وہاں انھوں نے تعلیم اور کلچر کا یہ سارا ڈھرا ہی بدل دیا۔ میکالے نے مکتب کی تعلیم بند کردی اور اس طرح سے گاؤں کے لوگ اس جاہلانہ ایشیائی تعلیم سے چھوٹ گئے، ادھر انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری کردیا گیا۔ جو صرف شہروں تک محدود رہا، اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں خواندہ ہندوستان ناخواندہ ہندوستان ہوگیا اور جہاں پہلے پچاس ساٹھ فی صدی لوگ اپنی زبان پڑھ لکھ لیتے تھے وہاں اب صرف پانچ سات فی صدی پڑھے لکھے رہ گئے اور وہ بھی انگریزی میں ایسی گٹ مٹ کرتے تھے جو بیشتر ہندوستانیوں کے پلے نہ پڑسکتی تھی۔ اس صورت حال پر اک اور تازیانہ جان گلکرائسٹ

نے لگایا۔ یہ بڑا مشہور ماہر فن تھا اور اس نے سنسکرت اور فارسی مٹا کے اردو اور ہندی دو نئی زبانیں ایجاد کیں، اور اس طرح سے ہندوستان میں اک نئے لسانی کلچر کا فرحت ناک باب کھولا۔ میکس مولر نے وید دریافت کئے اور انگریزی انجینیروں نے مغلیہ حماموں کی محیر العقول صنعت کی ریسرچ کی اور محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی محکمہ آثار قدیمہ نہ تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے لوگ خود نت نئی عمارتیں بناتے تھے اور فن تعمیر میں جدتیں روا رکھتے تھے۔ اب نئی عمارتیں بننا بند ہو گئیں اور حاکموں نے پرانی عمارتوں کی دیکھ بھال کے لئے محکمہ آثار قدیمہ کھول دیا۔ یہ بھی ایک ماہر فن کا اعجاز ہے!

ماہر فن نے ہندوستان کا نقشہ بدل ڈالا، اس کی تاریخ بدل دی۔ اسے نئی زندگی عطا کی، اور اس زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ایک نئے طب کو ایجاد کیا، ان ماہرین فن کے آنے سے پہلے ہندستان میں صرف آٹھ دس امراض ہوتے تھے، بخار، دمہ، بواسیر، پیچش، کوڑھ، مرگی، ہذیان، جنون، اور اسی قسم کی دو چار اور اَلا، بَلا بیماریاں۔ اور بس اپنی طبابت یہاں پر ختم ہو جاتی تھی، اور ان عوارض کے علاج کے طریقے بھی گنے چنے تھے، ماہر فن نے ان سب کو یک قلم موقوف کیا۔ وہ لوگ نئی دوائیں ساتھ لائے، اور ساتھ ہی نئی بیماریاں بھی۔ مثلاً ہیضہ، پلیگ، آتشک، میننجائٹس،

کہ ان بیماریوں کا وجود ان ماہرین فن کے آنے سے پہلے اس ملک میں ثابت نہیں ہوتا، اور اب تو بیماریوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بیمار کم ہیں اور بیماریاں زیادہ اور بسا اوقات آدمی مرجاتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اسے کونسی بیماری لاحق ہوئی تھی۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں ماہرین فن نے ہندوستانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جس کے جھول انھوں نے درست نہ کیے ہوں اور اپنی دانست میں ٹھیک ٹھاک کرکے اسے کام کا نہ بنا دیا ہو، اس سے ہندوستانیوں کو جو فائدہ ہوا، وہ تو ظاہر ہے، لیکن دوسرے ماہرین فن کے لیے بڑی مصیبت ہوگئی ہے، ادب، تاریخ، سیاست کلچر، تعلیم، قانون، رواج، ہندوستانی زندگی کا کوئی ایسا کونا کھدرا نہیں جہاں گزشتہ ماہرین فن کی لوح ثبت نہ ہو۔ اب نئے آنے والے ماہر فن کیا کریں۔ اور کس طرف اپنی توجہ مبذول کریں یہ سوال بڑا ٹیڑھا ہے۔ اور کئی ایک ماہر فن کو پریشانی میں ڈالے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر مجھے گزشتہ دنوں دلی میں ایک فرانسیسی ماہر فن سے متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ گزشتہ پچیس سال سے اس ملک میں مقیم ہیں اور ہندوستانی ساڑی کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ جب میں نے ان سے اس کے بارے میں سنا تو بہت حیران ہوا۔

"ہندوستانی ساڑی۔ مگر اس میں ریسرچ کی کونسی بات ہے؟ میرا مطلب ساڑی سے ہے، اسے پہننے والی عورت سے نہیں ظاہر ہے کہ اس میں ریسرچ کی بہت گنجائش ہے!" "ارے صاحب، یہی تو بات ہے، کہ آپ ہندوستانی ہوکر بھی اپنے ملک کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ مثال کے طور پر کیا آپ جانتے ہیں کہ شیروانی، اچکن، پاجامہ، بلاوز، کوٹ، پٹی کوٹ، انڈرویر، جراب، موزہ، بنیان، گلوبند، ہر ایک شئے کے متعلق ماہرینِ فن ریسرچ کر چکے ہیں، لیکن ساڑی —— اس حسین لباس کے متعلق کسی کو ریسرچ کرنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوا۔ اور یہ کام مجھ ہی کو سوجھا، موسیو شفیر کو۔ ایک فرانسیسی کو۔" اتنا کہہ کر فرانسیسی ماہرِ فن ایک مرغ کی طرح چھاتی پھلانے لگے اتنے میں انھیں کھانسی نے آگھیرا اور آپ کھانستے کھانستے اکڑوں ہوگئے۔

"مگر موسیو شفیر، اس میں ریسرچ کی کیا بات ہے؟ ساڑی ایک سیدھا سادہ ہندوستانی لباس ہے، جسے ہندوستان کی عورتیں کئی طریقے سے پہنتی ہیں۔ پنجابی عورتیں جو ساڑی کو شلوار کی طرح استعمال کرتی ہیں، یو۔پی کی عورتیں جو ساڑی کو لہنگے کی طرح استعمال کرتی ہیں، مدراسی عورتیں جو ساڑی کا لنگوٹ بناتی ہیں، گجراتی عورتیں کہ ساڑی سے [illegible] کا کام لیتی ہیں۔ بس یہی دو چار باتیں ہیں ساڑی میں اور اس میں کیا دھرا ہے۔"

"ہاں! یہ تو مجھے معلوم ہے، مگر پچاس سال کے عرصے میں جو بات میں اب تک معلوم نہیں کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں اس ساڑھی کو پہنتی کیسے ہیں؟ ——— دیکھئے میں ایک شریف فرانسیسی ہوں۔ کسی ہندوستانی خاتون سے کیسے پوچھ سکتا ہوں، ہم فرانسیسی لوگ دنیا کی متمدن ترین قوم ہیں!"

میں بھونچکا رہ گیا۔

موسیو پیئر کہہ رہے تھے "لوگ کہتے ہیں کہ ساڑی ایک لباس ہے۔ مجھے تو کچھ لباس معلوم ہوتے ہیں۔ پیچھے سے کچھ اور ہے، سامنے سے کچھ اور ہے، کولہوں کے پاس کچھ اور ہے، گھٹنوں کے پاس کچھ اور ہے اور پھر سامنے چھاتی پر ایک لکیر کی طرح سکڑ جاتا ہے اور شانے سے گزر کر ایک آبشار کی طرح نیچے گرتا ہے۔ خدارا ہمیں بتاؤ کہ یہ لباس کیا ہے، کتنے ٹکڑوں میں بٹا ہے اور اسے کس طرح پہنا جاتا ہے؟ میں تو یہی سوچ سوچ کر بوڑھا ہو گیا۔"

میں نے کہا "دراصل اس کی تاریخ بہت پرانی ہے، اب آپ پوچھتے ہیں تو بتانا ہی پڑے گا۔ ایک پردیسی ماہر فن کی مدد کرنا ہر ہندوستانی کا دھرم ہے۔ تو سنئے۔ شروع میں عورتیں جب چرخہ کاتتی تھیں تو سوت اپنے گرد یوں لپیٹ جاتی تھیں کہ دو ماہ میں اپنے اردگرد ایک ساڑی بن لیتی تھیں۔ لیکن یہ طریقہ اب بہت پرانا ہو گیا ہے اور ہندوستان کے زمانۂ جاہلیت کی یادگار رہ گیا ہے۔"

فرانسیسی ماہرِ فن نے شیفر کا قلم نکال لیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ میری باتوں کو اپنی نوٹ بک میں درج کر رہا تھا۔

"اس کے بعد وہ زمانہ آیا" میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب ساڑی چرخے پر نہیں کھڈی پر بنی جاتی تھی جب ساڑی تیار ہو جاتی تو اسے اک مٹی کے بت کے گرد باندھ دیا جاتا اور پھر جب ساڑی اس کے گرد بندھ جاتی تو یہ مٹی کا بت جو بیچ میں سے کھوکھلا ہوتا تھا۔ توڑ دیا جاتا، اور عورت پاؤں کی طرف سے اس کھوکھلی ساڑی میں داخل ہوتی اور اسے پہن لیتی۔ یہ طریقہ بہت دیر تک رائج رہا۔ لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں، ایک تو یہ کہ ہر بار ساڑی پہننے کے لئے مٹی کا بت تیار کرنا پڑتا تھا دوسرے پاؤں کے راستے ساڑی میں داخل ہونے سے اس میں کئی جھول پڑ جاتے تھے، جس سے ساڑی کی خوبصورتی میں فرق پڑتا تھا اس لئے یہ طریقہ بھی زیادہ دیر تک مقبول نہ رہ سکا۔"

"پھر؟"

"پھر موجودہ طریقہ رائج ہوا۔ جب ساڑیاں ملوں میں مشینوں کے ذریعے تیار کی جانے لگیں۔ دراصل مسٹر شیفر، موجودہ ہندوستانی ساڑی ایک لباس نہیں ہے، اس کے چھ ٹکڑے ہیں، ایک ٹکڑا کولہوں کے گرد تیار کیا جاتا ہے۔ دوسرا ٹکڑا اس کے نیچے رانوں سے پنڈلیوں تک، تیسرا ٹکڑا پنڈلیوں سے ٹخنوں تک پھیلا ہوتا ہے، چوتھا

ٹکڑا ناف سے شانے تک، پانچواں شانے کے پیچھے ـــــــــ"

"اور چھٹا ؟"

"چھٹا ٹکڑا کبھی سر پہ ہوتا تھا۔ مگر آجکل نظر نہیں آتا"

"خوب! تو گویا یہ ایک ساڑی چھ ٹکڑوں کا لباس ہے۔ مگر صاحب میں نے تو بازار میں کئی ساڑیوں کو دیکھا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ ہر ایک ساڑی کو دیکھا ہے، مگر یہ تو ایک ہی ٹکڑا ہوتا ہے"

"ہاں ہاں ہوتا ہے ایک ہی ٹکڑا، مگر صرف خریدتے وقت خریدنے کے بعد چھ ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ عورتیں انھیں اپنے ہاں کاٹ کر الگ الگ فٹ کر لیتی ہیں، اور اس کے بعد اپنے جسم پر سنگر مشین چلا کر پھر ان ٹکڑوں کو جوڑ لیتی ہیں۔ اس طرح کہ اگر کوئی عورت پھر اپنی ساڑی اتارے تو وہ پھر ایک ہی ٹکڑا معلوم ہوگی۔ آپ نے کبھی کسی عورت کو ساڑی اتارتے دیکھا ہے؟"

"جی نہیں،" فرانسیسی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا، "ایسا اتفاق تو کبھی نہیں ہوا"

"خیر جانے دیجئے، اس کے لئے دوسرے ماہر فن کی ضرورت ہے"

(۲)

میں نے سمجھا چلو اس ماہر فن سے جان چھوٹی، مگر اسکی

تیسرے یا چوتھے روز وہ مجھے پھر کناٹ پلیس میں گھومتا ہوا مل گیا۔ بڑا اداس اداس سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا "ہلو، پروفیسر شیفر"
مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمودار ہوئے
بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "میں جلد ہی فرانس لوٹ جاؤں گا۔ مگر ایک مسئلہ بڑا ٹیڑھا آن پڑا ہے۔ حل ہی نہیں ہوتا۔ اگر آپ اس میں میری تھوڑی سی مدد کریں"

"ضرور، ضرور، فرمائیے"

"یہ میں قطب مینار کے بارے میں غور کر رہا تھا، اب آپ دیکھئے نا، اتنی بڑی عمارت، اتنے بوجھل پتھر، اتنی اونچائی تک کیسے لیجائی گئی؟ جس زمانے میں یہ عمارت بنی تھی، اس زمانے میں ہمیں معلوم ہے کرین تک موجود نہ تھی۔ پھر اتنے بڑے بڑے پتھر اتنی اونچائی پر کیسے لیجائے گئے؟" ہمارے ہاں پیرس میں ایفل ٹاور ہے، مگر وہ تو لوہے سے بنا ہے۔ پہلے اسے زمین پر لٹا کر ڈھال لیا گیا تھا، پھر کرینوں کے ذریعے سیدھا کر لیا۔ یہ قطب مینار ہے۔" اس نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"
میں نے کہا "اس کی تعمیر کے متعلق وثوق سے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ دراصل دلی کی عمارتوں کے متعلق ہر چیز پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ اب اس قطب مینار ہی کو لیجئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسے زمین پر لٹا کر تیار کر لیا گیا۔ بعد میں رسے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا"

"ونڈر فل!" فرانسیسی نے کہا۔

"ایک روایت جو زیادہ معتبر ہے وہ یہ ہے کہ یہ مینار جہاں پہ واقع ہے، وہاں پر کسی زمانے میں ایک پہاڑی تھی، سنگ سرخ کی۔ یہ مینار اس پہاڑی کو کھود کھود کے تیار کیا گیا ہے۔ اور عمارتیں تو زمین کے نیچے سے شروع ہوتی ہیں اور اوپر آسمان کی طرف جاتی ہیں، قطب مینار کی عمارت اوپر سے شروع ہوئی اور کھودتے کھودتے زمین کے اندر چلی گئی۔"

"سبحان اللہ"

"اور جب یہ عمارت بن گئی تو پہاڑی کے باقی ماندہ حصے کو کاٹ کوٹ کے پھینک دیا گیا۔ اب صرف قطب مینار یہاں پہ کھڑا ہے۔"

"بجا فرماتے ہیں آپ، دوسری روایت معتبر معلوم ہوتی ہے کیونکہ دلی شہر میں اکثر مقامات پہ ابھی تک ایسی پہاڑیاں باقی ہیں میرا خیال ہے کہ قطب مینار ہی نہیں پورا دلی ہی اسی طرح پہاڑیوں کو اوپر سے نیچے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ جبھی تو اس کی عمارتیں باہر ایسی سرخ اور اندر سے اتنی تاریک ہیں۔ ایک پہاڑی گپھا کی طرح واہ وا واہ! آپ نے کیا بات سمجھائی ہے۔"

میں نے کہا "پھر ایک نکتہ اور بھی ہے اور ہمارے بزرگوں کی عقل کی دلیل ہے، وہ ہماری پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ

عمارت تیار کرتے تھے۔ اور آجکل جب سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ عمارت بنانے کے لئے چونا، گارا، سیمنٹ، اینٹ، پتھر، گرڈر، لکڑی، ہر چیز الگ الگ ملتی ہے تو ایک مکان بھی تیار نہیں ہو سکتا آپ ہی بتائیے حکومت ہند کی ہزار کوشش کے بعد نئی یا پرانی دلی میں گزشتہ چھ برس میں ایک مکان بھی تعمیر ہوا ہے۔

"نہیں! نہیں بس۔۔۔ مگر۔۔۔ میں تو فرانسیسی ہوں، آپ لوگوں کی سیاست میں کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ آپ کی آزادی کا اعجاز ہے۔ آپ چاہے مکانوں میں رہیئے چاہے باہر پالے سے مر جائیے۔ اڈیو موسیو، میں دو تین روز میں فرانس چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے پھر آپ سے ملاقات نہ ہو، اس لیے حد شکریہ!"

(۴۳)

مگر اس واقعے کے دوسرے روز کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ڈرائنگ روم میں پروفیسر صاحب دھرے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا صاحب، جہاز میں جگہ نہیں ملی؟"

"نہیں موسیو، آپ برا نہ مانئے گا۔ ایک اور مسئلہ آن پڑا ہے۔ اور اس قدر اہم ہے کہ فرانسیسی حکومت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ضرور اس کا بھید معلوم کروں، کیا آپ

ہماری مدد کریں گے ؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں، اگر ممکن ہو سکا تو"

"صاحب وہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے"

"آپ بتائیے تو"

"صاحب یوں تو ہندوستانی بازار میں بہت سی مٹھائیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس "جلیبی" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

میں نے کہا "میری دل پسند مٹھائی ہے"

فرانسیسی چٹخارہ لیتے ہوئے بولا "پسند تو مجھے بھی بہت ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس میں رس کیونکر بھرا جاتا ہے ؟"

"خاموش! خاموش! میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا ؟" فرانسیسی پروفیسر نے پریشان ہو کر پوچھا

میں نے کہا "یہ ہمارا قومی راز ہے۔ اگر میں نے آپ کو بتا دیا تو حکومت مجھے پھانسی پر چڑھا دے گی"

موسیو شیفر میرے پاؤں پر گر پڑے۔ گڑگڑا کر بولے "آپ کا راز میری روح میں دفن رہے گا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں یہ ۔۔۔ یہ لیجئے بیس ہزار فرانک۔ خدارا بتا دیجئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ پیرس میں بہت سے ہندوستانی حلوائی پہنچ گئے ہیں۔ اور وہ لوگ جلیبی تیار کرتے ہیں۔ اور اب پیرس کا یہ حال ہے کہ لوگ

جلیبیوں پر لوٹے پڑتے ہیں اور ہماری فرانسیسی مٹھائیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ خدا کے لئے غریب فرانس کی مدد کیجئے۔"

میں نے فرانک جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "سنئے موسیو شیفر، ماہر فن آپ ہیں، میں نہیں ہوں۔ پہلے آپ یہ بتائیے آپ کی اس بارے میں ریسرچ کا کیا عالم ہے؟"

موسیو شیفر نے کہا "صاحب میری تو سمجھ میں خاک نہیں آتا۔ میں نے کئی بار جلیبی کا معائنہ کیا، یہ سوچ کے کہ کہیں اس میں فاؤنٹن پن کی طرح کا کوئی ایسا آلہ تو نہیں لگا ہوا ہے کہ جس سے رس خود بخود جلیبی کے اندر چلا جاتا ہے۔ مگر ہزار بار معائنہ کرنے پر اور جلیبی کو محدب شیشے میں دیکھنے اور اسے خوردبین سے دیکھنے پر بھی کسی سیفٹی پن کا انکشاف نہ ہوا۔ اب یہ جلیبی شکل و صورت میں بھی ایسی ٹیڑھی شئے ہے کہ اس کی ابتدا، انتہا کا بھی پتہ نہیں چلتا، ورنہ میں ماہر فن ہوں، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کسی شئے کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے دو ہی طریقے ہیں، یا تو آدمی ابتدا سے چلے، اور انتہا تک جائے، یا اس کی انتہا سے شروع ہو اور ابتدا تک پلٹ آئے۔ یہاں تو ابتدا انتہا دونوں راستے بند ہیں۔ عقل کیا کام کرے"

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا "اب میں آپ پر وہ قیمتی راز افشا کرتا ہوں جو ہندوستانی تہذیب و تمدن کا مرکز ہے، ہماری

تجارت کا ملجا و ماوا ہے، ہمارے سیاست دالوں کا مرغوب مشغلہ ہے، اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جلیبی میں رس کیسے بھرا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں گا کہ رس گلے میں بھی رس کیسے بھرا جاتا ہے تاکہ اس کے بعد آپ غریب خانے پر دوبارہ قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف نہ کریں، اور سیدھا اپنے پشتارۂ علم کی تدوین کے سیدھے پریس چلے جائیں۔

"سنئے، جلیبی میں رس بھرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک قدیم، دوسرا جدید۔

"قدیم طریقہ تو بڑا سیدھا ہے اور اکثر حلوائی جو قدامت پسند ہیں بلکہ یوں کہیے جو رجعت پسند ہیں۔ وہ میدے کو گھول کے سیدھی پنسل کی طرح جلیبی بنا لیتے ہیں۔ اور اس کا منہ کھول کر اس میں ایک چراغ سے رس اندر انڈیل کر اس کا منہ بند کر کے اسے پھر ہاتھ سے گول کر دیتے ہیں، اور پھر اسے گھی یا تیل یا بناسپتی میں تل لیتے ہیں۔

"دوسرا طریقہ!"

"ہاں ہاں! دوسرا طریقہ خدارا جلد بتائیے، میں بیتاب ہوں"

"دوسرا طریقہ جدید ہے۔ یعنی نیا ہے، اسے ترقی پسند حلوائی استعمال کرتے ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی بنا کے تل لی جاتی ہے اور بعد میں

اس میں رس بھرا جاتا ہے "
" مگر کیسے ؟ کیسے ؟
" انجکشن کے ذریعہ ! "
" انجکشن ! او مائی گاڈ ! " فرانسیسی اچھل پڑا ۔ میں کس قدر احمق ہوں ! کتنا آسان طریقہ ہے جلیبی میں رس بھرنے کا ، او مائی گاڈ ! "

فرانسیسی ماہر فن پھر کبھی واپس نہیں آیا ۔ پیرس پہنچ کر اس نے مجھے خط بھی نہیں لکھا ۔ پیرس پہنچ اس نے ایک کتاب ضرور لکھی ہے ـــــــ " ہندوستان کے تین سربستہ راز ، ساڑی قطب مینار ، جلیبی " ـــــ یہ اس کتاب کا عنوان ہے ، اس کتاب نے دنیائے مغرب میں اک تہلکہ مچا دیا ہے ۔ اور موسیو شیفر کا شمار دنیا کے مشہور ترین عالموں میں ہوتا ہے ، اس کتاب میں میرا ذکر کہیں نہیں ہے ۔ موسیو شیفر نے خود اپنی پچیس سالہ ریسرچ سے ہندوستان کے ان رازہائے درون پردہ کا انکشاف کیا ہے ۔ موسیو شیفر آج کل اکاڈمی فرانس کے ممبر ہیں اور امسال نوبل پرائز بھی حاصل کر چکے ہیں ۔

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے
میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا
ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف
زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی
کوشش کی ہے، لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی، جس
سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار
کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان
مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نہ جانے
کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو
بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے

"چھوٹے صاحب" مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ ___ کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟"

"آٹھ سال"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا، در اصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں، لیکن کبھی لکھ نہیں سکا، ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا، اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے پچکے

پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھرّیوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے، اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے، اس کی چاردیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے، لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے، اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے ہر منزل میں دیکھا ہے، بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے، وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے، حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں، لیکن کالو بھنگی

اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے، اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے، تاکہ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں... ... ...؟

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی، وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا، کمپونڈر صاحب کی بکری، اور ڈاکٹر صاحب کی

گائے کو چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتا، اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا، بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلاناغہ۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا، لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں، لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے، آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے، مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر اک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاوش ہے، اک ایسی مجبور بے زبانی ہے، اک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نجانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی سے کھلیان سجائے تھے

اور یہ قانیت کے رومانی نظریے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بو قلموں کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی، اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صمٌ بکمٌ ۔ مگر اب یہ جائے گا ضرور ۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا، اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں ۔ للّٰلہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، سیٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے، اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا، اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آبا و اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا، وہ دن بھر اپنا

کام کرتا اور رات کو سو جاتا۔ اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا
بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی۔ اور وہ یہ
کہ اسے اپنی ننگی چند یا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس
کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے
وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس
کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک
کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے، اور گائے اس کا سر
چاٹ رہی ہے۔ بار بار۔ اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا چٹواتا اونگھ اونگھ
کر سو گیا ہے، اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں
مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا۔ اور کائنات
کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گماں ہونے لگتا تھا، میں
نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کو حسین ترین عورتیں، پھولوں کے
تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں
لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی
منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا
تھا، اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان
بہت نیلا اور صاف، اور کالو بھنگی کی چند یا شیشے کی
طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا

چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کُسر کُسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹنے کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی۔ تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا، اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے۔ لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پہ جان چھڑکتی تھی۔ اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے، لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی، ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی، اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں، جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا ہے، لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے

ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر
کرنے نکلے ہیں، راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا
تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو
توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی
کھا رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے۔ اور ان سے بھی
برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر کبھی
کان پھڑپھڑا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی
گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ
میں تو کچھ نہیں آتا تھا، کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے پھر چند
لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ
دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی
کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا
ننھا چشمہ تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح
سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا
اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے، کیونکہ بچارے
انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو
بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس
اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس
انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو

بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے
اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں اک سکون
آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا، اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو
مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیئے سوزن
کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئٹر بن رہی ہے
اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو
کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے
کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور اکثر اپنے لنگڑے
ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا اور بھوکا رہتا اور
زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر و تواضع میں لگا
رہتا۔ کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا، اس
کے زخموں پہ مرہم لگاتا، اسے مکّی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا
لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ
کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو۔ اور کھانا کھا کے
اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی
اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی
دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن کالو بھنگی
اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند

سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا، کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا، تیتر، رت گلہ، گٹاری، لال چڑا، سبز مخی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہُل سنکر تائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر وہ مکّی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا، وہ آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکّی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی سوندھی میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا، اک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹّے بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے بد ذائقہ اور معمولی سے بھٹّے ہوتے تھے، وہ کہ انھیں بس مکّی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹّا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پہ سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس

پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہات کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا، اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پہ جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاونٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کیسی چھوٹے صاحب؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی"

"نہیں چھوٹے صاحب" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلیے، ممکن ہے ....!)

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟ ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" وہ سوچنے لگتا۔ "آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے" پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں، ... ... ، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ۔ کتنے روپے ہوگئے، چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"

"ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں۔ اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے!"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی اجب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے، اس وقت بھی میں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں۔ اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!" (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہو گی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟" ... ... "ہم کیا بتائیں خاک،

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب"

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا، اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا۔ اور ایک چپراسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا، وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا، لیکن ہم کوئی اس کے

رشتے دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط
ہو گئی، کیونکہ کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ اور جب وہ مرا اس روز
بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال
کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے، مریضوں
نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا
اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا، اور
لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولس والوں نے
از راہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب
کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ
کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے بیکار چلاتی رہیں
جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

× × × × × ×

× × × × ×

× × × ×

× × ×

× ×

×
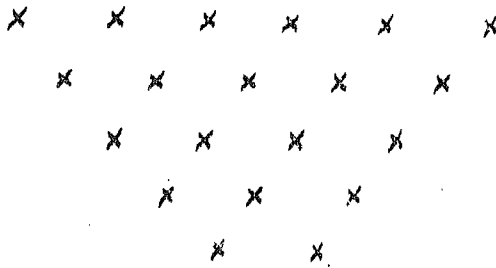
ارے تو پھر جھاڑو دے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟

بتا دوں گا۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے۔ کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمہارا نام کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی، کوئی اچنبھا، معجزہ نہیں ہوا، جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی، آج کل تو پچیس پچاس میں نہیں ہوتی۔ مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا، وہ جوان ہے، اس کے چہرے پہ رنگت ہے۔ یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے، وہ سفید لٹھے کی

شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پہ کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار
تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا
بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ
لیتا ہے۔ اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے، وہ نوراں
اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں بھیتا سے آئی تھی، سولہ سترہ
برس کی الھڑ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار
کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بیوقوف تھی وہ اپنے گاؤں کے
دو نوجوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے
آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو
اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی
تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں
درحالیکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا
ہے، یعنی عشق اُس سے بھی ہے اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں
ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر
عشق غائب، سچائی کی فرد ہوتی ہے، لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی
لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے
بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی، اس کے
ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے
اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل پگھل

کانپنے لگتا، جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں، اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے، اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے، اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں، اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں، اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے۔ اور کوئی اپنی باہوں میں بھینچ لے۔ ہائے۔ پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی، دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے۔ اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا، اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہونچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا۔ اور نوراں کے بازو پہ زخم آگئے۔ اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی، اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے۔ مگر وہ بچ گئی۔ کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی

اور یہاں اس کا علاج شروع ہوگیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے، انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ، ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں، ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا، بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں۔ جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا، مجبور ہو کے رہ جاتا، اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی، وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی، اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی۔ اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے

وقت اس نے خلجی کے دئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا، اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا، لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی۔ اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی، اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی۔ اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار اک اظہارِ تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا

نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے معافی مانگنے کے لئے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی، اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہات میں نہ لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی، ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے، اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا۔ اور پٹواری بھی، اور وہ دونوں خر دماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے۔ اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا، اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا۔ اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سیکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پرکیف زندگی تھی خلجی کی۔ لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ:۔

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں، اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا۔ اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتشدان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا، تین ماہ دس روز تک

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس

نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا۔ اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گارے سے اپنی چیڈیا چھڑوانے لگتا۔ لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا، جو کچھ تم رہے ہو۔ تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ۔ سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے، کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

× × × × × ×

× × × × ×

× × × ×

× × ×

× ×

×
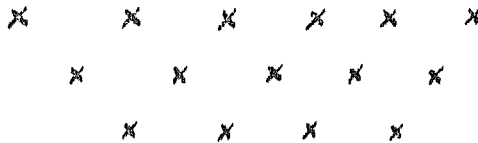
مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی چھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا۔ اور بختیار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بختیار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا کسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے۔ جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کڑم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیں اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں۔ اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بختیار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے، بختیار کے تین بچے ہیں اس کی بوڑھی ماں

ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بختیار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بختیار کا بڑا لڑکا ماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا۔ اور بختیار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بختیار کی بیوی جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہوگئی۔ پھر کر بڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دئے ہوں۔ اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پہ پھیل گئی۔

"اماں"، بختیار کی بیوی زور سے چلائی۔

" اماں" بختیار چلایا
" اماں" کالو بھنگی نے آواز دی۔
جنگل گونج کے خاموش ہوگیا۔
پھر کالو بھنگی نے کہا۔" میرا خیال ہے وہ نگر گئی ہوگی تمہارے ماموں کے پاس"
نگر کے دو کوس ادھر انھیں بختیار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی۔ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بختیار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہوگئی اور بختیار کی بیوی نے اسے تھام لیا۔ اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے، بختیار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہونچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہوگیا۔ اور اپنا سر کھجانے لگا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بختیار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں

تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص
کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں، لیکن تمہارے
متعلق اتنا کچھ کریدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا
کیا کیا جائے، خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ بہت ستالیا
تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح
میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ اور میرے افسانوں میں
اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں
تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں

لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں
سن، تو چاہتا ہے نا کہ کوئی تیرے گندے کھردرے
پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے
ان کی بیوائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں
کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری
رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے، تیرے پیٹ کی
مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے
کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں
تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے
انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال
دے۔ تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا
کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے اک مصفّا
لباس دیدے، تیرے ارد گرد ایک چھوٹی سی چار
دیواری کھڑی کر دے، حسین مصفّا پاکیزہ۔ اس
میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے
پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے۔ وہ میں نہیں کر سکتا
میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی
پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چھوتا
ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو

دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر، جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو، یہ ہے میرا بیٹا، یہ ہے میرا بیٹا۔ اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ۔ آٹھ روپے، میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، ایک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لئے میں

اکیلا کافی نہیں ہوں، اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر، اور کمپونڈر، اور بجلتیار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار، اور حاکم اور سیاست داں، اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیئے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے۔ یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے، اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھوئے۔ اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا۔ جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی

مجھ سے تیری جھاڑ و جھڑا دے، اور تیرے ہاتھوں کو نرمی
سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے!

ہماری دوسری کتابیں

"نئے انسان" قدوس صہبائی کا انوکھا ناول۔ ہندوستان کے انقلابی ماحول میں حسن وعشق کی کارفرمائیاں۔ سماجی انقلاب میں عورت کی مرد سے ہمسری کی کشمکش اور محبت کا آخری فیصلہ نئے انسانوں کے عشق ومحبت کی نئی داستان۔ چار روپے

"ڈھونگ" شوکت تھانوی کا نئے مزاحیہ ڈھنگ کا ناول
قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

"آنکھ مچولی" شکیلہ اختر کے نسوانی جذبات اور سماجی زندگی کے نئے افسانے، اپریل سنہ ۴۸ء میں تیار ہوگا،

"کانجی ہاؤس" ماہر القادری کا نفسیاتی ناول۔ شاعرانہ طرز بیان اور دلکش سلیس زبان کا آئینہ دار ہے۔ زیر طبع

"زندگی کا میلہ"
"سنگ میل"
"ادب اور انقلاب"
} اختر حسین رائے پوری کی تصانیف زیر طبع

"آزادی کی منزلیں" سنہ ۱۸۵۷ء سے ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء تک

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی مختلف منزلوں پر بتدریج
قومی شاعروں کی وطنی نظمیں اور وطن پرست ادیبوں کے مضامین
اور حقیقت افروز افسانے سردار جعفری نے ترتیب دئے ہیں یہ
چار سو صفحات سے زیادہ کی کتاب ماہ جون سنہ ۴۶ء میں تیار ہوگی۔